اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور جو تم میں صاحب امر ہوں ان کی اطاعت کرو

(القرآن)

ہندوستان

اور

مسئلۂ امارت

تالیف

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی رحمۃ اللہ علیہ

(نائب امیر شریعت بہار واڑیسہ)

شائع کردہ

شعبۂ نشر و اشاعت امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ 800005

Scanned with CamScanner

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	ہندوستان اور مسئلۂ امارت
تالیف	:	حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی رحمۃ اللہ علیہ
		(نائب امیر شریعت بہار واڑیسہ)
کمپوزنگ	:	سید شہاب احمد منعمی، منعمی کمپیوٹر، احمد مارکیٹ، دریاپور، پٹنہ ۴
طباعت	:	دی پرنٹو اسٹیشنرس، دریاپور، پٹنہ۔۴ موبائل:9386384222
ناشر	:	مکتبہ امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ
قیمت	:	-/65 (پینسٹھ روپے)
نیا ایڈیشن	:	۱۴۳۶ھ
تعداد	:	۲۰۰۰ (دوہزار)

ملنے کا پتے

- مکتبہ امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ (بہار)

فون: 0612-2555351
2555014
2555280
Fax : 2555280
email: nazim_imart@rediffmail.com
website: www.imartsharia.org

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

انتساب

استاذی حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجادؒ

نائب امیر شریعت کے حکم سے میں نے اس کتاب کو ان کی حیات ہی میں لکھا تھا، اور دلی ارمان تھا کہ چھپنے کے بعد تکمیل حکم کی مسرت کے ہاتھوں سے استاذ کے حضور میں پیش کروں گا، لیکن آہ! کہ یہ خوش نصیبی میرے حصے میں نہ تھی۔

اس لئے میں آج بجائے مسرت کے حسرت کے آنسوؤں کے ساتھ اپنی اس کتاب کو ان کے نام کے ساتھ انتساب کرتا ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

عبدالصمد رحمانی

۲؍ ذی قعدہ ۱۳۵۹ھ

حضور امیر شریعتِ ثانی قدس سرہ کا ارشاد گرامی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامدًا و مصلیًا و مسلماً

میں نے اس رسالہ کو اوّل سے آخر تک بغور دیکھا، بتوفیق الٰہی مصنف علام نے مسئلہ امارت کو آیات بینات اور احادیث سید الکائنات اور دلائل قویہ اور براہین واضحہ سے ایسا ثابت کیا ہے کہ اہل انصاف پر یہ مسئلہ مثل آئینہ واضح ولائح ہوگیا، اس رسالہ میں یہ خصوصیت ہے کہ مخالفین کے جو اہم و مشکل اعتراضات سمجھے جاتے تھے ان کے جوابات بھی صرف عقلی و بے سند نہیں دیئے ہیں؛ بلکہ ہر جواب اور جواب کے مویدات کو بھی حوالجات کتب معتبرہ سے مؤثق کرتے گئے ہیں۔ اللہ پاک مصنف کو جزائے خیر دے۔ اور اس محنت کا بہترین ثمرہ عطا کرے۔ آمین!

مسلمانان بہار سے عموماً اور اپنے احباب و متوسلین سے خصوصاً ملتمس ہوں کہ اس رسالہ کو ضرور بہ نظر انصاف ملاحظہ فرمائیں، اور امارت شرعیہ کی شرعی اہمیت و ضرورت کو محسوس کرکے اس پر عمل کریں۔ فقط

محمد محی الدین قادری، پھلواری شریف

۱۳؍ شوال بروز پنجشنبہ ۱۳۵۹ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

ہندوستان

اور

مسئلۂ امارت

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
انتساب	۳	مسئلۂ امارت؛ احادیث کی روشنی میں	۴۲
حضور امیر شریعت کا ارشاد گرامی	۴	اسلام اور التزام جماعت	۴۲
نقش ثانی	۷	جماعتی زندگی کی نوعیت	۴۹
دیباچہ از علامہ سید سلیمان ندویؒ	۹	حاصل بحث	۵۳
تمہید	۱۳	بغیر امیر شرعاً جماعت نہیں	۵۵
مسئلۂ امارت قرآن حکیم کی روشنی میں	۱۷	اسلام اور قیام امارت	۵۵
جماعتی زندگی کا لزوم اور دار الاسلام اور دار الکفر میں اس کے احکام کا عموم	۱۷	اسلام اور امارت فی دار الکفر	۵۹
جماعتی زندگی کی تشکیل	۲۴	واقعہ یمامہ	۶۶
فکر و نظر کا ایک گوشہ	۲۶	دار الحرب میں حضور ﷺ کے مقرر کردہ امراء	۶۸
اطاعت امیر کا وجوب اور اس کا عموم	۲۷	مسئلۂ امارت تصریحات فقہائے کرام کی روشنی میں	۷۰
دار الکفر میں قیام امارت اور نصب امیر کی نظیر	۲۸	مسئلۂ امارت علمائے امت کے فتاویٰ کی روشنی میں	۸۳
حضرت طالوت کا واقعہ	۳۰		

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
علامہ ابن تیمیہؒ کا فتویٰ	۸۳	قرآن مجید کے انداز بیان کے متعلق ایک علمی نکتہ	۱۱۱
امام سید سمہودی کا فتویٰ	۸۴	والی کی حیثیت کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا معیار	۱۱۴
علامہ ابن حجرؒ کا فتویٰ	۸۵	حضرت ابوذر غفاریؓ کا واقعہ	۱۱۴
علامہ نخمی مالکیؒ کا فتویٰ	۸۵	حضرت حذیفہؓ کا واقعہ	۱۱۵
علامہ ابو الحسن شافعی کا فتویٰ	۸۶	والی کی نظری حیثیت	۱۱۸
قاضی جمال الدین کا فتویٰ	۸۶	تسلیم امیر کی نوعیت	۱۲۰
نواب صدیق حسنؒ والی بھوپال کا فتویٰ	۸۸	معترضین کی محرومی (ان کی دو حدیثیں)	۱۲۱
حضرت مولانا شاہ عبد العزیزؒ کا فتویٰ	۹۰	پہلی حدیث قہر و سطوت کی شرط پر غلط استدلال	۱۲۲
امور ملکی میں عدم مداخلت کا مطلب۔ حاشیہ	۹۰	صحیحین کی حدیث کا صحیح مطلب	۱۲۳
شیخ یوسف اور مولانا عبد الحئی، رحمہما اللہ کا فتویٰ	۹۱	دوسری حدیث	۱۲۵
مسئلۂ امارت؛ تاریخی واقعات کی روشنی میں	۹۴	امام ضعیف کی تعریف	۱۳۰
امیر کی حیثیت	۹۷	"الامام الضعیف ملعونٌ" کے غلط معنی کی خطرناک غلطی پر تنبیہ	۱۳۳
والی کی شرعی حیثیت	۹۸	مسلم قوم کی شخصیت اسلام کی نظر میں	۱۴۱
ولایت کی حقیقت	۱۰۳	خطاب علمائے کرام	۱۴۷
والی کی حیثیت کے متعلق قرآن کا معیار	۱۰۴	اعداد استطاعت	۱۴۸
قوت و امانت	۱۰۵		
(قوت کے معنی قہر نہیں)			
مادی طاقت ولایت، امارت کے لئے شرط نہیں	۱۰۸		
ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۱۰		

Scanned with CamScanner

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہندوستان

(اور)

مسئلۂ امارت

ازحضرت العلامہ مولانا سید سلیمان ندوی، قدس سرہٗ

آج ''ہندوستان اور مسئلۂ امارت'' کے ایک مسئلہ پر کچھ سطریں لکھنے بیٹھا ہوں، یہ صدیق حمیم مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ مرحوم کے (جن کو اصلاً مرحوم لکھتے ہوئے قلم تھرّاتا ہے) سب سے اخیر حکم کی تعمیل ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ہندوستان میں جب سے مسلمانوں کی امامت وسیاست ختم ہوئی، مولانا اسمٰعیل شہید کی تحریک کی ناکامی کے بعد مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس بھولے ہوئے سبق کو یاد دلایا۔ نظری طور سے تو اس زمانے میں کئی ارباب ہوش کو یہ سبق یاد آیا۔ مگر عمل کی دنیا میں مولانا سجادؒ کے کارنامے کے سوا کوئی اور کوشش بروئے کار نہیں آئی۔ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ۔

امامت کیا ہے؟ کسی ایک لائق شخص کی سرداری میں افراد امت کی ایسی شیرازہ بندی، کہ ان پر جماعت کا اطلاق ہو سکے۔ احکام شرعی کا نفاذ واجراء بقدر امکان انتظام پا سکے اور جمعہ و جماعت اور نکاح وطلاق ومیراث وغیرہ کے احکام کی تنفیذ ہو سکے۔ اور اگر اس سے زیادہ قوت ہو تو استخلاف وتمکین فی الارض کا وہ فرض بھی ادا ہو سکے جس کی بشارت قرآن پاک نے دی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی پراگندگی اور انتشار کی جو کیفیت ہے اس پر کس حساس مسلمان کی آنکھیں اشکبار نہیں۔ لیکن کسی مریض کی حالت زار پر تیمارداروں کے آنسو، خواہ وہ

کتنے ہی مخلصانہ ہوں، آپ شفا کا کام نہیں دے سکتے، اس کے لئے تو دوا کی تلاش میں دوڑ دھوپ، طبیبوں کی کھوج میں سعی وکوشش اور مریض کو دوا پلانے کے لئے جدوجہد، تاکید وابرام ہی کام آسکتا ہے۔

آج سے بیس برس پہلے ملت کے طبیبوں نے ایک نسخہ لکھا۔ لیکن اس نسخہ کے نفع وضرر کے پہلو سے ہٹ کر اس نسخہ کے جواز وعدم جواز کی بحث شروع ہوگئی، جو آج کے دن تک جاری ہے اور اس عرصہ میں طرفین سے بحث ومباحثہ کا ایک دفتر تیار ہوگیا۔ برادر عزیز مولوی عبدالصمد صاحب رحمانی نے مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی فرمائش سے اس بحث پر یہ عالمانہ رسالہ اس غرض سے لکھا ہے کہ لوگوں کے اوہام وشکوک دور ہوں، اور حقیقت کا منظر جلوہ طراز ہو۔ مصنف موصوف ماشاء اللہ فقہی مسائل میں بصیرت رکھتے ہیں اور تفقہ فی الدین کی دولت خداداد سے بھی سرفراز ہیں، میں نے ان کے اس رسالہ کو پڑھا اور اپنے مقصد میں اس کو کامیاب پایا۔ فَجَزَاہُ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

میری سمجھ میں تو ذاتی اغراض سے بلند ہو کر ان اختلافات کا منشا ایک ہی نظر آتا ہے مسئلہ کے مؤید کی نظر میں عدم استطاعت کے سبب سے مکی امامت کا نقشہ ہے، اور مخالف کی نگاہیں مدنی امامت کا جلوہ ڈھونڈھتی ہیں۔ بات بالکل ٹھیک ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ مکی امامت کی تمہید کے بغیر مدنی امامت کا مقصد جلوہ پیرا نہیں ہو سکتا۔ غار حرا کے سکون سے پہلے غزوۂ بدر کا شور پیدا نہیں ہو سکتا۔ کاش کہ تمہید اور مقصد کے فرق کو سمجھ لیا جاتا تو اس کشاکش کی نوبت نہ آتی۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مکی زندگی میں بھی جو مادّی بیکسی وبےبسی اور سیاسی عجز وضعف کا عہد تھا۔ ہمارے لئے امام کی حیثیت سے بھی ویسے ہی مُطاع اور واجب الطاعۃ تھے، جیسے اپنی مدنی زندگی میں۔

امام شعرانی نے کشف الغمۃ میں جو فقہ الحدیث میں ان کی ایک تصنیف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے، جو ہمارے پیش نظر نسخہ (مطبوعہ کاستیہ مصر ۱۲۸۱ھ) کے صفحہ ۲۰۰ جلد دوم باب الامامت الکبریٰ میں ہے کہ ''امام ضعیف ملعون ہوتا ہے۔ اس سے

Scanned with CamScanner

مخالفوں نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ فوجی و مادی طاقت کے بغیر امامت کسی حال میں نہیں ہو سکتی، مصنف نے اس کا تشفی بخش جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ بشرط ثبوت حدیث امام ضعیف سے مراد وہ امام نہیں جس کے جلو میں فوج و لشکر، اور ہاتھ میں تیغ و خنجر نہ ہو، بلکہ وہ امام مقصود ہے جس میں اپنی رائے صوابدید کے قائم کرنے کی بصیرت، اور ظاہر کرنے کی قوت نہ ہو، خواہ یہ عدم قوت، رائے صوابدید کی محرومی کی بنا پر ہو، یا افراط رحم و شفقت کی بنا پر، عدل کی سنگین میزان کے توازن کو قائم نہ رکھنے کے سبب سے ہو یا جزئی معاملات میں حق گوئی کی افراط کے سبب سے، مصالح شرعی میں سیاست اور جماعت کے فوز و فلاح کا باریک نکتہ نگاہ سے چھپ جاتا ہو۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حق گوئی میں کس کو شک ہو سکتا ہے؟ جبکہ خود خیر البشر صلوات اللہ علیہ نے اس کی شہادت دی کہ ''اس آسمان کے نیچے، اس آفتاب کی روشنی میں ابوذرؓ سے بڑھ کر کوئی حق گو نہیں''، لیکن اسی کتاب کشف الغمۃ (جلد اول باب احکام الولی علی الایتام) میں ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ میرے حبیب صادق صلعم نے فرمایا ''یا ابا ذرٍ انی اراک ضعیفًا وانی اَحب لکَ ما اُحبّ لنفسی فلا تأمرّن علی اثنین ولا تولین مال یتیم ''یعنی اے ابوذر، میں تم کو ضعیف پاتا ہوں اور میں تیرے لئے وہی پسند کرتا ہوں جو خود اپنے لئے...... لہٰذا تم دو پر بھی حکمراں نہ بنو، اور نہ کسی یتیم کے مال کے ولی بنو'' تو سوال یہ ہے کہ کیا اس ضعف سے مراد، ضعف عسکری ہے، حالانکہ یہ عہد مدنی ہے۔ اسلام کی عسکری طاقت قائم ہے جو والی اور قاضی ہوگا اسلام کی طاقت اس کے جلو میں ہوگی۔ تاہم آنحضرت صلعم، ابوذرؓ کو اس قوت سے خالی پاتے ہیں جو کسی امیر و والی و قاضی کے انتخاب کے لئے شرط اول ہے۔

بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی، حاصل یہ ہے کہ نظریات سے قطع نظر کر کے عملی پہلو پر آیئے، میں نے بارہا کہا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ اگر کسی ایک مرکز پر مسلمان مجتمع نہ ہوئے تو یہ ہندوستان آگے چل کر مسلمانوں کے لئے بڑا اچھوتا نہ ثابت ہوگا، جس کا تھوڑا سا مزہ وہ چکھ چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ حسب استطاعت ہم ایک علَم کے نیچے جمع ہوں تا کہ ہمارے جمعہ و

جماعت، ہمارے اعیاد، رویت ہلال، صوم و افطار اور زکوٰۃ و خیرات، ائمہ و موذنین، مکاتب و مدارس، مساجد و مقابر، نکاح و طلاق، فسخ و تفریق، تبلیغ و ارشاد اور دوسرے مذہبی صیغے اور شعبے کسی ایک انتظام میں آجائیں۔ اور مسلمان افراد کی رکھوالی اور دیکھ بھال، غریبوں کی امداد، یتیموں کی کفالت، بے نواؤں کی مدد، نومسلموں کی حفاظت، گمراہوں کی ہدایت وغیرہ کے کام تنظیم کے ساتھ انجام پا سکیں اور ہماری مذہبی و قومی خیرات کی کوڑی کوڑی سنت سنیہ کے مطابق ایک بیت المال میں جمع ہو کر مستحقین میں خرچ ہو سکے۔ بالفعل ہماری شرعی امارت اسی تنظیم کا نام ہے۔ ع

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

سید سلیمان ندوی

دارالمصنفین۔ ۲۵ رشوال ۵۹ ۱۳ھ

(اعظم گڈھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً

امت مسلمہ کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ وہ ایسے دین ومذہب کی حامل ہے جو دنیا کا سب سے اول اور سب سے آخر خداوندی دین ومذہب ہے اور جس کے متعلق ہر طرح کی تحقیق اور تنقید کے بعد یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا واحد دین ہے جو اپنے اندر ہر تشنہ کام کی پیاس بجھانے کا سامان رکھتا ہے۔

اسی لئے اس دین حق کی کتاب ''قرآن مجید'' (جو اسلامی مذہب کا اصل واساس ہے اور انسان کے معاش ومعاد کا مکمل دستور العمل اور جامع دستاویز ہے، اور نفوس انسانی کی تہذیب وتزکیہ اور اجتماعیات کی سازگاری وبرتری کا کامل ترین امین ہے) انسان کے جملہ شعبہائے زندگی کے لئے بغیر تخصیص زماں ومکان نہایت جامع تعلیم پیش کرتا ہے وہ جس طرح خدا کی ذات وصفات اور نبوت ورسالت سے بحث کرتا ہے۔ اسی طرح عبادات، اخلاق، تمدن اور سیاست سے بھی بحث کرتا ہے اور اصولی اور کلی حیثیت سے کسی شعبۂ زندگی کو تاریکی میں چھوڑ کر اپنے پیروؤں کو متحیر وششدر رہنے کا موقع نہیں دیتا چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدۃ۔۳) آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لئے دین اسلام کو میں نے پسند کیا۔

(۲) وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ (الزمر۔۲۷) اور ہم نے اس قرآن میں سبھی طرح کی مثالیں بیان کی ہیں؛ تا کہ لوگ دھیان کریں۔

(۳) وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰۤی اَکْثَرُ النَّاسِ اِلَّا کُفُوْرًا (بنی اسرائیل۔۸۹) ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں طرح طرح سے بیان کیں، پھر بھی اکثریت کا یہ حال ہے کہ وہ ناشکرے ہیں۔

(۴) وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ (النحل۔۸۹) ہم نے آپ پر کتاب اتاری، جو ہدایت کی ہر بات کو بیان کرتی ہے اور فرمانبرداروں کے لئے ہدایت ہے، رحمت ہے، بشارت ہے۔

(۵) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ (البقرہ۔۱۸۵) رمضان کا مہینہ جس میں وہ قرآن اتارا گیا ہے جو تمام لوگوں کے لئے ہدایت نامہ ہے اور ہدایت اور برے بھلے کی تمیز کے لئے بیّنات ہے۔

رہا ان کا شرح وبیان اور ہر اصول کی توضیح وتنقیح تو قرآن مجید کا اس کے متعلق خود اپنا بیان ہے کہ یہ حامل وحی کا فریضہ ہے۔

(۱) وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمْ (ابراہیم: پ۔۱۳) اور کسی رسول کو ہم نے نہیں بھیجا لیکن اس کی قوم کی زبان کے ساتھ تا کہ وہ اس کے لئے اچھی طرح تمام تعلیمات الٰہی کو) بیان کرے۔

(۲) وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ (النحل۔۴۴) (اے پیغمبر) ہم نے تم پر یہ قرآن اتارا ہے تا کہ تم اچھی طرح سمجھا دو تمام لوگوں کو وہ تمام احکام جو ان کی طرف نازل کئے گئے ہیں، اور پھر وہ لوگ خود سوچیں۔

(۳) هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعۃ۔۲) اللہ نے مسلمانوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا؛ جو ان پر خدا کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے اور ان کو خدا کی کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

Scanned with CamScanner

پھر اللہ تعالیٰ کی تعلیم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح وتوضیح کے ماتحت حوادث آتیہ اور جاریہ کا استخراج فقہائے امت کا منصب ہے، کیونکہ تفصیلی جزئیات اور حوادث ایسے ہیں جو ہمیشہ قیامت تک ہر زمانہ میں ضرورت اور وقت کے لحاظ سے نئی نئی شکلوں میں رونما ہوتے رہیں گے، ان کا ذکر نہ تو صراحۃً الہامی کتاب میں مناسب تھا نہ بیانِ رسالت میں، اس لئے کہ ان جملہ جزئیات اور حوادثات کا ذکر جو رہتی دنیا تک وقوع میں آتے رہیں گے: قرآن وحدیث میں تفصیل کے ساتھ ہوتا تو علاوہ اس کے کہ یہ ایک بارگراں ہوتا۔ بے وقت کی بے لطف شہنائی بھی ہوتی؛ جس میں ابتدائے عالم کے انسان کو انتہائے عالم کی ضرورتوں سے باخبر رہنے کی تکلیف عبث بلکہ: تکلیف مالا یطاق ہوتی۔ حالانکہ الہامی دین کا بنیادی اصول، احکام کے بارے میں یہ ہے کہ:

(۱) لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ (البقرہ-۲۸۶) خدا وسعت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا ہے۔

(۲) یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ ۖ (بقرہ-۱۲۳) اللہ تمہاری آسانی چاہتا ہے، تمہاری دشواری نہیں چاہتا ہے۔

(۳) مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ۚ (الحج-۷۸) خدا نے دین کے معاملہ میں تم پر تنگی نہیں کی ہے۔

(۴) یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا۔ (النساء-۲۸) اللہ تمہاری تخفیف چاہتا ہے، اس لئے کہ انسان خلقۃً کمزور ہے

(۵) مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ حَرَجٍ ۖ (المائدہ-۶) خدا یہ نہیں چاہتا ہے کہ تم کو تنگی میں مبتلا کر دے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو ان لفظوں میں بیان فرمایا:

بُعِثْتُ بِالحنیفیة السمحة۔ میں سیدھے اور سہل دین کو لے کر مبعوث ہوا ہوں۔

بہرحال قرآن مجید انسان کے جملہ معاشی اور معادی احکام کا کلی حیثیت سے جامع دستاویز ہے اور احادیث نبوی اس کی ضروری تشریح اور بیان ہے جو وحی الٰہی ہونے کی حیثیت سے ہر طرح کے سہو وخطا سے پاک ہے۔ اس کے بعد فقہائے امت کے اجتہاد ہیں جو قرآن وحدیث سے مستنبط ہیں۔

امارت شرعیہ

اس مختصری تمہید کے بعد ہم "مسئلہ امارت" کو سب سے پہلے قرآن مجید کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید نے دار الکفر[1] میں مسلمانوں کی زندگی کے لئے کیا فیصلہ کیا ہے؟ آیا یہ کہ ان کی زندگی کو مطلق العنان اور پراگندہ چھوڑ دیا ہے کہ وہ انتشار وفوضویت کی زندگی گذاریں، یا اس زندگی سے مسلمانوں کو اسی طرح روکا ہے جس طرح دار الاسلام[2] میں منع کیا ہے۔

اس کے بعد ہم اس کی تشریح اور بیان، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیش کریں گے کہ دار الکفر میں پراگندگی اور تفریق کو مٹانے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لئے کیا لائحہ عمل بتایا ہے۔

ان دونوں حیثیتوں سے بحث کرنے کے بعد ہم فقہائے امت کے فتاوے پیش کریں گے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں انہوں نے کیا سمجھا اور کیا استنباط کیا ہے۔ پھر علمائے امت کے فتاویٰ، پھر تاریخی واقعات پیش کریں گے۔

---

۱ دار الکفر دنیا کے اس حصۂ ملک کو کہتے ہیں جہاں غیر مسلموں یعنی کافروں کا غلبہ ہو اور اس کے قوانین و احکام ملک میں نافذ ہوتے ہوں۔ خواہ ان کی کوئی باضابطہ آئینی حکومت ہو یا غیر آئینی، جمہوری ہو یا شخصی اور اسی قسم کے ملک کو فقہائے اسلام کی اصطلاح میں دار الحرب بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے ملک میں احکام اور قوانین الٰہی کی تنفیذ کے لئے حرب وجنگ بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ کسی وقت مجبوراً یا مصلحۃً اس ملک کے حاکم کفار سے جنگ نہ ہو اور بظاہر امن وامان ہو۔

۲ دار الاسلام دنیا کے اس حصۂ ملک کو کہتے ہیں جہاں مسلمانوں کو حاکمانہ اقتدار حاصل ہو عام ازیں کہ اس ملک میں شخصی حکومت ہو یا شورائی (بطریق خلافت راشدہ)

Scanned with CamScanner

مسئلہ امارت

قرآن حکیم کی روشنی میں

دارالاسلام میں مسلمانوں کی طرز معاشرت کے متعلق قرآن مجید نے کیا ہدایت کی ہے؟ یہ قرآن مجید کی مدنی سورتوں سے معلوم ہوسکتی ہے، کیونکہ ان کا نزول دارالاسلام مدینۃ النبی میں اس وقت ہوا ہے، جب مسلمان کفار کے نرغوں سے نکل کر مدینہ منورہ انصار کی حمایت میں آ چکے تھے اور دشمنان اسلام کی شرارتوں کے استیصال کے لئے میدان جنگ میں نکلتے تھے اور فتح ونصرت ان کا ہر جگہ استقبال کرتی تھی۔

اسی طرح دارالکفر میں مسلمانوں کی طرز معاشرت کے متعلق قرآن مجید نے جو کچھ ہدایات دی ہیں، وہ مکی سورتوں سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ ان کا زمانہ نزول نبوت کے وہ تیرہ برس ہیں جب کہ مسلمان مکہ معظمہ میں جو دارالکفر تھا، مظلومانہ زندگی گذار رہے تھے، اور دن ورات ان پر مظالم توڑے جاتے تھے۔

ان دونوں زندگیوں میں شرعی حیثیت سے کہاں تک اور کن کن چیزوں میں اشتراک ہے اور کن کن چیزوں میں تفاوت ہے، ایک بسیط اور طویل بحث ہے جن کی تفصیلات میں جانا ہم نہیں چاہتے ہیں۔ اس موقع پر ہم محض اس حیثیت سے غور کرنا چاہتے کہ۔ **دَارُالاسلام** اور **دَارُالکُفر** کی زندگیوں میں انتشار، پراگندگی، فوضویت مطلق العنانی اور تفریق کی جہت سے کوئی تفاوت ہے یا نہیں؟

جماعتی زندگی کا لزوم اور دارالاسلام اور دارالکفر میں اس کے احکام کا عموم:

قرآن مجید کی روشنی میں جس نے اس کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے، ایک منٹ کے لئے بھی یہ تصور نہیں کرسکتا ہے کہ قرآن مجید نے اس طرح کی تفریق کی ہے کہ دارالاسلام میں تو مسلمانوں کے طرز زندگی کے متعلق یہ ہدایت دی ہو کہ وہ تفریق وپراگندگی سے بچیں اور جماعتی

زندگی گذاریں اور دارالکفر میں اس کی اجازت دی ہو کہ وہ مطلق العنان فوضویت کی زندگی اختیار کریں، اور جماعتی زندگی سے تعلق نہ رکھیں، کیونکہ جس طرح اس نے دارالاسلام میں تفریق اور انتشار سے منع کیا ہے اسی طرح اس نے دارالکفر میں بھی اس سے روکا ہے اور منع کیا ہے، مدنی سورتوں میں جہاں یہ احکام ملتے ہیں کہ:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران۔۱۰۳)
سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو، ٹولی ٹولی نہ بن جاؤ۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ (آل عمران۔۱۵۹)
کاموں میں آپ ان سے (یعنی مسلمانوں سے) مشورہ کیجئے، اور جب عزم مصمم کر لیجئے تو پھر اللہ پر بھروسہ کیجئے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ (آل عمران۔۱۰۵)
تم لوگ ان کی طرح نہ ہو جو کہ اس کے بعد بھی کہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آ چکی تھیں ٹولی ٹولی بن گئے تھے اور اختلافات کرنے لگے تھے،

جن کا مفاد یہ ہے کہ مسلمانوں کو متحدہ جماعتی زندگی بسر کرنی چاہیئے اور انفرادی زندگی یا ٹولی ٹولی بن کر نہ رہنا چاہیئے، مکی سورتوں میں بھی یہ تصریحات موجود ہیں۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ (الشوریٰ۔۱۳)
(مسلمانو) خدا نے تمہارے لئے جس دین کو جاری کیا ہے اور جن کا نوحؑ کو حکم دیا تھا اور (اے محمد ﷺ) تمہاری طرف جس چیز کو ہم نے وحی کی ہے اور اس کا حکم ہم ابراہیم اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، وہ یہ ہے کہ دین کی اقامت کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۚ (الشوریٰ۔۳۸)
ان کا کام (یعنی مسلمانوں کا) باہمی مشورہ سے ہوتا ہے اور ہمارے دیئے ہوئے سے خرچ کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

وَاٰتَیْنٰهُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا ہم نے ان کو دین کی کھلی ہوئی باتیں عنایت کیں
اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْیًاۢ پھران لوگوں نے علم آجانے کے بعد باہمی یعنی
بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ عدوان کی وجہ سے اختلاف کیا جن چیزوں
الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝ ثُمَّ میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے اس کا پروردگار
جَعَلْنٰكَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لاریب قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ اس کے
لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ بعد ہم نے آپ کو دین کی ایک شریعت عنایت کر
(الجاثیۃ۔۱۷) دی ہے۔ پس آپ اسی کی پیروی کیجئے اور
نادانوں کی خواہش کا اتباع نہ کیجئے۔

یعنی جس طرح مدنی زندگی میں جو "دارالاسلام" کی زندگی تھی صریح الفاظ میں (۱) تفرق سے ممانعت کی گئی (۲) اجتماعی زندگی کی ہدایت کی گئی (۳) باہمی مشاورت کے ذریعہ کام کرنے کا حکم دیا گیا (۴) اور یہ تنبیہ کی گئی کہ اگلی امتوں کی طرح خدا کی طرف سے بینات ملنے کے بعد تفرق فی الدین اور پراگندگی اور فوضویت کی زندگی اختیار کرنے کی غلطی میں اپنے کو مبتلا نہ کرو۔

اسی طرح مکی زندگی میں بھی جو دارالکفر کی زندگی تھی پوری وضاحت کے ساتھ (۱) تفرق وانتشار سے روکا گیا (۲) اور اسی کے ساتھ جملہ مسلمانوں کو مخاطب کرکے اقامت دین اور عدم تفرق کا حکم کیا گیا جو وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا کی دوسری تعبیر ہے، کیونکہ لَا تَفَرَّقُوْا کی مثبت صورت اجتماعی زندگی کے سوا دوسری چیز نہیں ہو سکتی ہے (۳) ان کے باہمی خوشگوار تعلقات اور طریق کار کے متعلق وحی الٰہی نے یہ شہادت دی کہ ان کی بنیاد باہمی مشاورت پر ہے (۴) اور پورے زور کے ساتھ اُن اگلی امتوں کی اتباع سے روکا گیا جنہوں نے خدا کی طرف سے علم ویقین کی راہ پانے کے بعد فوضویت اور اختلاف کی گمراہی میں اپنے کو مبتلا کر دیا تھا۔

پھر سورہ شوریٰ کی پہلی آیت میں بھی یہی نہیں فرمایا گیا ہے کہ محض امت مسلمہ کے لئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ تفرق وفوضویت کی گمراہی میں مبتلا نہ ہوں بلکہ بتایا کہ آدم ثانی حضرت نوح علیہ السلام سے

لے کر آپ تک اور درمیان میں جتنے صاحب شریعت پیغامبر ہوئے ان سب کو یہ اصولی حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ دین کی اقامت کریں اور تفریق کی غیر شرعی زندگی سے اجتناب کرتے رہیں جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ شریعت الٰہیہ کی بنیاد اور اساس اور دین الٰہی کا خلاصہ اور ماحصل فقط دو چیزیں ہیں۔ دین کی اقامت اور تفریق کی غیر شرعی زندگی سے احتراز اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو یکساں طور پر بلاتخصیص زمان ومکان ہمیشہ مطلوب ومقصود رہی ہیں۔ اور جملہ انبیاء کرام ہمیشہ اس کے داعی رہے ہیں۔ بہرحال یہ آیت اس مقصد پر نص صریح ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت ہی سے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت بھی نہیں فرمائی تھی۔ امت مسلمہ جماعتی زندگی کے لئے مامور تھی اور تفرق وفوضویت کی زندگی سے منع کیا گیا تھا، اور یہ وہ معنی ومطلب ہے جس پر تمام مفسرین وعلماء محققین کا اتفاق ہے، ذیل میں بہ نظر اختصار ہم چند حوالے پیش کرتے ہیں:۔

صاحب معالم التنزیل **ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیه** کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

(۱) **ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیه** اللہ نے جملہ انبیاء کرام کو دین کی اقامت،
بعث اللّٰه الانبیاء کلهم باقامة الفت اور جماعت کے لئے مبعوث کیا ہے اور
الدین والالفة والجماعة افتراق اور مخالفت کے ترک کے لئے۔
وترک الفرقة والمخالفة۔ (معالم التنزیل)
(معالم التنزیل، ۵۱۶)

صاحب مدارک علامہ ابوالبرکات نسفی حنفی۔ ولا تتفرقوا فیه کے ذیل میں لکھتے ہیں:

(۲) **ولا تتفرقوا فیه۔ ولا تختلفوا** دین میں اختلاف نہ کرو۔ حضرت علیؓ کا ارشاد
فی الدین قال علی رضی اللّٰه ہے کہ آپس میں افتراق نہ کرو۔ اس لئے کہ
تعالیٰ عنه لا تتفرقوا فالجماعة جماعتی زندگی رحمت ہے اور تفرق وجدائی
رحمة والفرقة عذاب۔ عذاب ہے۔ (مدارک)
(مدارک لابی برکات النسفی الحنفی)

Scanned with CamScanner

علامہ شیخ زادہ اس آیت یعنی شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا۔ کی تفسیر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

(٣) قيل وما ذلک المشروع فقيل هو اقامة الدين والاجتماع عليها وترک التفرق فی اقامته فان الامر اذا انتظم علی هذا الوجه زال الفساد وظهر العدل و تباعد الناس عن التظالم فيتفرغون لعمارة دنياهم ويتوصلون بها الی اقامة دينهم وينالون المنزلة الرفيعة عند ربهم۔

یہ سوال کہ وہ امر مشروع کیا ہے جس کا اس آیت میں ذکر ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ وہ دین کی اقامت ہے اور دین پر اجتماع ہے اور دین کی اقامت میں افتراق سے الگ رہنا ہے۔ اس لئے کہ جب تمام کام اس طرح ایک دینی نظام کے ماتحت ہو جاتا ہے تو فساد مٹ جاتا ہے اور عدل کا ظہور ہوتا ہے اور باہمی ستم کوشی سے لوگ الگ ہو جاتے ہیں اور پھر اپنی دنیا کی تعمیر کے لئے انہیں موقع ملتا ہے جس کے ذریعہ وہ اقامت دین بھی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند مرتبہ پاتے ہیں۔

(شیخ زادہ حاشیہ بیضاوی)

صاحب درمنثور لکھتے ہیں کہ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ کے متعلق

(۴) عن قتادة ان اقيموا الدين ولا تتفرقوا فيه۔ قال تعلموا ان الفرقة هلكة وان الجماعة ثقة۔ (درمنثور)

حضرت قتادہؓ کا قول ہے کہ یاد رکھو افتراق ہلاکت ہے اور جماعت ثقہ ہے۔ (ایک مستحکم زندگی ہے جس کے ذریعہ ہلاکت سے نجات ہے۔)

علامہ ابن کثیر اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ

(۵) وصى الله تعالیٰ جميع الانبياء عليهم الصلوٰة والسلام بالائتلاف والجماعة ونهاهم عن الافتراق والاختلاف۔

اللہ تعالیٰ نے جملہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ائتلاف اور جماعت کی وصیت کی ہے اور ان کو افتراق اور اختلاف سے روکا ہے۔

(ابن کثیر ص:١٠٧، ج:٩)

وما تفرقوا الا من بعد ما جاءهم العلم کے ضمن میں صاحب تفسیر روح

المعانی لکھتے ہیں:-

(٦) وهذا يؤيد ما دل عليها سابقا من ان الامم القديمة والحديثة امروا باتفاق الكلمة واقامة الدين۔

یہ آیت پہلی آیت کی تائید کرتی ہے کہ تمام امت چاہے وہ قدیم ہوں یا جدید سب کے سب اتفاق کلمہ اور اقامت دین کے مامور ہیں۔

(تفسیر روح المعانی)

امام فخر الدین رازی اپنی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ

(٧) (المسئلة الثالثة) قوله تعالیٰ ان اقيموا الدين ولا تتفرقوا فيه يشعر بان حصول الموافقة امر مطلوب فی الشرع والعقل و بيان منفعته من وجوه (الاول) ان للنفوس تاثيرات واذا تطابقت النفوس وتوافقت علی شئی واحد قوی التاثير۔ (الثانی) انها اذا ترافقت صار كل واحد منها معينا للآخر فی ذالک المقصود المعين و كثرة الاعوان توجب حصول المقصود۔ اما اذا تخالفت و تنازعت و تجادلت فضعفت فلا يحصل المقصود (الثالث) ان حصول التنازع ضد مصلحة العالم لان ذلک يقضی الی الهرج والمرج والقتل والنهب۔ الخ (تفسیر کبیر)

اللہ تعالیٰ کا قول، ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ اس امر کی طرف ہے کہ اتفاق سے مل کر رہنا شرعاً اور عقلاً امر مطلوب ہے اور اس کی منفعت کی مختلف وجوہ ہیں (اول) یہ کہ انسانی نفوس کے لئے تاثیرات ہیں اس لئے جب جملہ نفوس کسی ایک چیز پر متفق ہو جاتے ہیں تو تاثیر قوی ہو جاتی ہے (دوم) یہ کہ جب انسانی نفوس متفق ہو جاتے ہیں تو ہر شخص دوسرے کا ایک مقصد خاص میں معین ہو جاتا ہے اور اعوان وانصار کی کثرت مقصد کے حصول کو لازمی چیز بنا دیتی ہے؛ لیکن آپس میں مخالفت اور جھگڑے رونما ہو جاتے ہیں تو ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور مقصد کا حصول نہیں ہوتا ہے (سوم) یہ کہ تنازع اور جھگڑے کا ہونا عالم کے مصالح کی ضد ہے، اس لئے کہ یہ جھگڑے قتل وغارت تک پہنچا دیتے ہیں۔

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

ان شواہد سے یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ **ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا** (جو مکی آیت ہے) **واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا** (جو مدنی آیت ہے) کی بعینہ دوسری تعبیر ہے۔ اور اقامت دین کے معنی، دین پر اجتماع، ائتلاف اور اتفاق کلمہ کے ہیں، اور اسی اجتماعی زندگی کی تفسیر و تشریح نہایت لطیف پیرایہ میں نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے حدیث صحیح میں اس طرح وارد ہے:

المسلم للمسلم کالبنیان یشد بعضہ بعضاً (بخاری شریف)	مسلمانوں کی اسلامی زندگی دیوار کی طرح ہے جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا پاتی ہے، اور سہارا دیتی ہے''۔

یعنی مسلمان شرعی نقطۂ نظر سے جہاں کہیں بھی ہوگا دیوار بن کر رہے گا، اس میں اجتماع وائتلاف پایا جائے گا، وہ متفرق متفرق اینٹوں کا ڈھیر بن کر نہیں رہے گا۔ کیونکہ قرآن حکیم کے نزدیک اختلاف، تفرقہ، انتشار، اسلامی تعلیم سے بغاوت کرنے کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ قرآن نے بار بار اس حقیقت کا اعلان کیا ہے اور مکی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں میں یکساں طور پر اس کا ذکر کیا ہے، ارشاد ہے:

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (البقرۃ:۲۱۳)	خدا کی کتاب میں کھلے کھلے احکام آچکنے کے بعد بغی وعدوان کے باعث ان ہی لوگوں نے اختلاف کیا جن کو کتاب دی گئی تھی۔
وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ع (الشوریٰ:۱۴)	یہ لوگ خدا کے ہاں سے علم آچکنے کے بعد باہم بغی وعدوان کی وجہ سے ٹولی ٹولی بن گئے۔
وَآتَيْنَاهُمْ بَيِّنَاتٍ مِنَ الْأَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (الجاثیۃ:۱۷)	ہم نے ان کو دین کی کھلی کھلی باتیں عنایت کی تھیں پھر بھی ان لوگوں نے علم آچکنے کے بعد باہمی بغی وسرکشی کی وجہ سے اختلاف کیا۔

جماعتی زندگی کی تشکیل:

بہر حال تفرقہ اور انتشار قرآن حکیم کی نگاہ میں بغاوت ہے اور دین پر اقامت اس کی نگاہ میں اجتماع کلمہ اور ائتلاف ہے، اور بالتخصیص زمان ومکان یکساں طور پر، چاہے مسلمان دارالاسلام میں ہو یا دارالکفر میں وہ اس کا مامور بنایا گیا ہے کہ جماعتی زندگی اختیار کرے، اور تشتت وافتراق اور فوضویت کی غیر شرعی زندگی اور گمراہی سے اپنے کو محفوظ رکھے۔ رہا یہ کہ اس جماعتی زندگی کی تشکیل کیا ہوگی؟ اور اس کو عملاً کیونکر برتا جائے گا؟ اس کی واضح تشریح اور توضیح اگرچہ احادیث نبوی میں ملے گی، جو قرآن کی صحیح معنوں میں تفسیر و بیان ہے، اور وحی الٰہی ہونے کی حیثیت سے ہر طرح کے سہو وخطا سے پاک ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم کا یہ اعلان ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ ع (النجم:۳)	وہ نہیں بولتے ہیں اپنے نفس کی خواہش سے، ان کا بولنا نہیں ہے مگر وحی جو ان پر نازل ہوتی ہے۔

مگر اس کے اجمالی بیان سے قرآن کریم بھی ساکت نہیں ہے، صرف غور وفکر کی ضرورت ہے۔ اتنی بات تو بہت واضح ہے کہ جماعت کا تحقق بغیر کسی قائد کے نہیں ہو سکتا ہے چاہے وہ نماز کی جماعت ہو، اور اس کے قائد کا نام امام رکھ لیا جائے، یا کوئی فوجی جماعت ہو اور اس کے قائد کا نام سپہ سالار، امیر عسکر، یا کوئی دوسرا نام رکھ لیا جائے یا اخلاقی، سیاسی، علمی، ادبی اور اقتصادی امور کے متعلق کوئی کمیٹی ہو اور اس کے قائد کا نام صدر رکھ لیا جائے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن حکیم نے ان آیتوں میں اشارہ کیا ہے۔ جہاں یہ بتایا ہے کہ خدا کے حضور میں جب جماعت باز پرس کے لئے طلب کی جائے گی تو ان کے قائد کو بھی بلایا جائے گا جس کو کہیں امام سے اور کہیں شہید سے اور کہیں دوسرے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ جماعت کے لئے امام، قائد کا ہونا قرآن حکیم کی نگاہ میں ایک حقیقت ثابتہ ہے، ارشاد ہے:

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ ۖ فَمَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَأُولَٰئِكَ يَقْرَءُونَ كِتَابَهُمْ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝ (بنی اسرائیل:۷۱)	جس دن ہر جماعت کو اس کے امام کے ساتھ بلائیں گے؛ پس جس کسی کو اس کی کتاب اس کے داہنے میں دی جائے گی؛ وہ لوگ اپنی کتاب کو (خوشی سے) پڑھیں گے اور ان پر ایک تاگے کے برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔

Scanned with CamScanner

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ؕ (النساء:۴۱)

کیا حال ہوگا جب ہم ہر جماعت سے ایک شہید لائیں گے اور آپ کو ان سب پر شہید ٹھہرائیں گے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ؕ (النحل:۸۴)

جس دن ہر جماعت سے ہم ایک شہید کھڑا کریں گے، پھر منکرین کو نہ توبات کرنے کی اجازت ملے گی، نہ ان کی توبہ قبول کی جائے گی۔

وَ نَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (القصص:۷۵)

ہم ہر امت سے اس کے شہید کو جدا کریں گے۔ پھر ہم کہیں گے کہ اپنی دلیل پیش کرو، تو وہ لوگ جانیں گے کہ حق اور سچائی خدا ہی کے لئے ہے اور جو کچھ وہ افتراء کرتے تھے، وہ سب کھو جائیں گے۔

پس جب کہ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو اس امر کا مامور بنایا ہے کہ وہ چاہے دار الاسلام میں ہوں یا دار الکفر میں، جماعتی زندگی گذاریں۔ اور جماعت کے لئے قائد کا ہونا ضروری ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ وہ اسی کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو قائد کے ہاتھ میں دیدیں جس کو فقہ وحدیث کی اصطلاح میں امیر اور والی سے تعبیر کرتے ہیں اور قرآن کریم میں انہیں قائدین کو اولوالامر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی لئے فقہائے اسلام مسلمانوں کی اسلامی اور جماعتی زندگی کے قیام وبقا کے لئے قیام خلافت وامارت کو واجب بلکہ اہم الواجبات کہتے ہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا اعلان خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس مشہور قول میں کیا ہے:۔

لا اسلام الا بجماعة ولا جماعة الا بامارة ولا امارة الا بطاعة۔ (جامع۔لابن عبدالبر ص:۶۲)

اسلامی زندگی نہیں ہو سکتی ہے بغیر جماعتی زندگی کے اور جماعتی زندگی نہیں ہو سکتی ہے بغیر امارت کے اور امارت کا مدار اطاعت پر ہے۔

دار الاسلام تو دار الاسلام ہی ہے، فقہاء دار الکفر میں بھی قیام امارت اور تقرر والی کو واجب لکھتے ہیں۔ رہا یہ کہ اپنے کو کسی قائد یا والی کے ہاتھ میں دیں تو کس طرح دیں، تو یہ فریضہ رسالت ہے؛ جس کا بیان احادیث نبوی میں ملے گا۔

نظر وفکر کا ایک اور گوشہ: میں نے مکی اور مدنی زندگی کی طرز معاشرت کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ ''ان دونوں زندگیوں میں شرعی حیثیت سے کہاں تک اور کن کن چیزوں میں اشتراک ہے اور کن کن چیزوں میں تفاوت ہے۔ یہ ایک بسیط اور طویل بحث ہے، جن کی تفصیلات میں ہم جانا نہیں چاہتے ہیں۔ اس موقع میں ہم محض اس جہت پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ دار الاسلام اور دار الکفر کی زندگی میں انتشار، فوضویت، پراگندگی، مطلق العنانی اور تفرق کی حیثیت سے کوئی تفاوت ہے یا نہیں الخ''۔

ہم اب بھی ان تفصیلات میں جانا نہیں چاہتے ہیں، اور نہ اس کا ہمارے لئے موقع ہے، لیکن غلط فہمی سے بچانے کے لئے اتنا عرض کردینا ضروری ہے کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ مکی سورتیں جن کا نزول دار الکفر میں ہوا ہے۔ اس کے جملہ احکام دار الکفر کے ساتھ مخصوص ہیں اور مدنی سورتیں جن کا نزول دار الاسلام میں ہوا ہے، اس کے جملہ احکام دار الاسلام کے ساتھ مخصوص ہیں۔

لیکن مذہب سے بیگانوں کو اس مختصر سے رسالہ کی ضمنی بحث میں یہ کس طرح سمجھایا جائے کہ اس اجمال کی تفصیل کیا ہے؟ بجز اس کے کہ اس موقع میں ان سے غالب کی زبان میں یہ معذرت کرتے ہوئے کہ۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل — کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

کہا جائے کہ اس جگہ آپ محض اتنا سمجھئے کہ مکی سورتوں کے وہ احکام جو دار الحرب سے خاص خصوصیت نہیں رکھتے ہیں، وہ تمام جہان کے مسلمانوں کے لئے عام ہیں۔ مثلاً خدا کی ذات وصفات سے تعلق رکھنے والے احکام، رسالت کے احکام، معاد کے احکام وغیرہ وغیرہ اسی طرح مدنی سورتوں کے وہ احکام جو دار الاسلام سے خاص خصوصیت نہیں رکھتے ہیں وہ تمام دنیا کے

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

مسلمانوں کے لئے عام ہیں۔ مثلاً روزہ کے احکام، زکوٰۃ کے احکام، حج کے احکام وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح نظام جماعت اور امارت کا مسئلہ ہے جو اسلامی زندگی کا جز ولاینفک ہے، اس کے متعلق قرآن مجید میں جو کچھ احکام ہیں، وہ مکی سورتوں میں ہوں یا مدنی میں، وہ عام ہیں، اور جغرافیائی حدود سے ہر حال میں بالاتر ہیں۔

اطاعت امیر کا وجوب اور اس کا عموم: قرآن مجید کی روشنی میں جس طرح امیر اور امام کے ساتھ وابستگی اور اس کے لزوم کا حکم ''جماعتی زندگی'' کی تعبیر میں موجود ہے اور اس کی طرف رہنمائی کی گئی ہے، اس امیر اور امام کے ساتھ وابستگی اور اس کے لزوم اور اس کی اطاعت کا حکم صریح الفاظ میں بھی دیا گیا ہے:-

اَطِیْعُوا اللّٰہَ الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ الخ (النساء:۵۹) — اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

یعنی دنیا کا ہر مسلمان اور ہر شخص اس کا مامور ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت، رسول اللہ ﷺ اور امیر کی اطاعت کرے۔

یہ آیت جس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کے وجوب پر نص صریح ہے، مسئلہ امارت اور امیر کی اطاعت کے وجوب پر بھی نص صریح ہے، اور جب امیر کی یہ حیثیت کہ ان کی اطاعت واجب ہے، اس وقت بتائی جا رہی ہے جب کہ رسول کریم ﷺ کی ذات موجود ہے جو مرکز امت اور نقطۂ مطاع ہے تو امیر کی یہ حیثیت بدرجہ اولیٰ اس وقت اجاگر ہوگی جب کہ ذات رسالت ﷺ ہماری آنکھوں سے اوجھل، عالم برزخ میں استراحت فرما ہو۔ نیز یہ آیت اس امر پر بھی نص صریح ہے کہ اولی الامر اپنے مفہوم میں عام ہے اور صیغہ جمع ہونے کی وجہ سے اولی الامر کے تمام انواع اور تمام مراتب کو محیط ہے۔ اس میں نہ خلیفۃ المسلمین کی تخصیص ہے، نہ دیگر ولاۃ امور کی، نہ دارالاسلام کے امراء کی تخصیص ہے، نہ دار الکفر کے امرا کی، نہ اس کی تخصیص ہے کہ وہ اولی الامر خلیفہ کا مقرر کیا ہوا ہو، یا شرعی طور پر مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کا انتخاب کردہ ہو۔ اور جب یہ آیت عام ہوئی تو اس سے ہر اس امیر کی اطاعت کا وجوب بھی نص صریح سے ثابت ہو گیا۔

جو شرعی اصولوں کے ماتحت امیر بنایا گیا ہو۔ چنانچہ اسی بنا پر مفسرین، اور محدثین اور فقہا نے ہر قسم کے امیر کی اطاعت کو واجب لکھا ہے۔ سراج المنیر شرح جامع صغیر میں ہے:-

قال العلقمي قال القاضي عياض وغيره اجمع العلماء على وجوب طاعة الامراء في غير معصية وعلى تحريمها في المعصية بقول الله تعالى اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم قال العلماء المراد باولى الامر من اوجب الله طاعته من الولاة والامراء. هذا قول جماهير السلف والخلف من المفسرين والفقهاء وغيرهم.
(سراج المنیر، جلد اول، ص:۲۰۵)

علامہ علقمی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس امر پر علماء نے اجماع کیا ہے کہ تمام امراء کی (جن کی امارت من جہۃ الشریعت ثابت ہو) اطاعت کرنی واجب ہے۔ ان امور میں جو گناہ کی بات نہ ہو اور اس پر بھی اجماع ہے کہ گناہ کی بات میں امیر کی اطاعت حرام ہے، بہ سبب فرمان اللہ تعالیٰ کے کہ ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ'' اور علماء نے فرمایا ہے کہ ''اولی الامر'' سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی فرمانبرداری کو اللہ تعالیٰ نے واجب بتایا ہے اور وہ لوگ ولاۃ اور امراء (شریعت) ہیں اور یہ قول جمہور مفسرین، فقہاء اور دیگر اسلامی جماعتوں کا ہے۔

اسی طرح تفسیر بیضاوی میں ہے:-

يٰأيها الذين أمنوا اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم يريد امراء المسلمين في عهد الرسول صلى الله عليه وسلم و بعده ويندرج فيهم الخلفاء والقضاة وامراء السرية. (بیضاوی، ج:۱، ص: مصری)

یا ایہا الذین آمنوا۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم سے مراد انہی مسلمانوں کے وہ تمام امراء ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے عہد میں تھے۔ یا بعد کو۔ اور ان امراء میں خلفاء اور قضاۃ اور امیر الجیش سب داخل ہیں۔

دار الکفر میں قیام امارت اور نصب امیر کی نظیر: نظام جماعت، مسئلہ امارت،

Scanned with CamScanner

پھر اس کے لزوم اور لزوم دوجوب کے دارالاسلام اور دارالکفر میں عموم کے احکام پر قرآن مجید سے استشہاد اور ثبوت کے بعد اس کی ضرورت نہ تھی کہ قرآن مجید کی آیات میں انبیائے پیشین امم ماضیہ کی سرگذشت اور حالات سے اس کی نظیر بھی پیش کی جائے کہ دارالکفر میں نصب امیر اور قیام امارت کا واقعہ موجود ہے۔ کیونکہ امتثال حکم اور تسلیم ورضا کے لئے ہر مسلمان کو فقط اس کے جاننے کی ضرورت ہے کہ کتاب وسنت میں اس کے متعلق کیا حکم ہے اور اس اطمینان کے بعد کہ یہ کتاب وسنت کا حکم ہے اس کی بجا آوری کے لئے نظیر ومثال کی ضرورت نہیں رہتی ہے، اور نہ یہ قرین عقل بات ہے کہ ہر حکم کے لئے کتاب الٰہی میں مثال ونظیر تلاش کی جائے۔

لیکن نظام جماعت اور مسئلہ امارت کی اس اہمیت کے اعتبار سے کہ یہ ایسا مسئلہ ہے جو سلسلۂ وحی الٰہی کی پوری تاریخ کا حاصل ہے، اور بفحوائے:۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (الشوریٰ:۱۳)

خدا نے تمہارے لئے جس دین کو جاری کیا ہے (اور) جس کا نوح کو حکم دیا تھا۔ اور (اے محمد ﷺ) تمہاری طرف جس چیز کی ہم نے وحی کی ہے اور اس کا حکم ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کو دے چکے ہیں، وہ یہ ہے کہ دین کی اقامت کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔

نظم جماعت اور مسئلہ امارت دین کا نچوڑ، دین کی اساس، دین کی بنیاد ہے جو نوح علیہ السلام سے لیکر خدا کے آخری نبی محمد ﷺ تک بالاتفاق مامور اور مطلوب ومقصود رہا ہے، قرآن مجید میں خصوصیت سے اس کے ہر پہلو کی طرف توجہ کی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں مسئلہ امارت کے تمام پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس مسئلہ کے اس پہلو کی طرف بھی رہنمائی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ انبیائے پیشین اور امم ماضیہ کے ایام میں ایسا موقع پیش آیا ہے کہ دارالکفر میں امارت کا قیام ہوا ہے اور نصب امیر کا فریضہ عملاً ایسی حالت میں انجام دیا گیا ہے کہ پوری قوم محکو

مانہ زندگی بسر کر رہی تھی، اور وہ حضرت طالوتؑ کی امارت کا واقعہ ہے جو سورۂ بقرہ میں ہے۔

حضرت طالوتؑ کا واقعہ حضرت طالوتؑ کی امارت کا قیام، اور آپ کا بحیثیت امیرؑ کے نصب (یعنی تقرر) کن حالات میں ہوا، اور کس طرح ہوا۔ قرآن مجید کی تمام تفسیروں میں مذکور ہے، اور اجمال وتفصیل کے سوا سب کا بیان اس واقعہ کے متعلق اپنے اندر یکسانیت رکھتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ سلف سے لیکر خلف تک اس واقعہ میں کوئی اختلاف نہیں رہا ہے۔

صاحب معالم التنزیل جو پانچویں صدی کے بزرگ ہیں، لکھتے ہیں:۔

لما مات موسیٰ علیہ السلام خلف بعده فی بنی اسرائیل یوشع ابن نون یقیم فیهم التوارة وامر الله تعالیٰ حتی قبضه الله تعالیٰ ثم خلف فیهم کالب بن یوقنا کذلک حتی قبضه الله تعالیٰ ثم خلف حزقیل حتی قبضه الله۔

جب موسیٰ علیہ السلام (انتقال فرما گئے تو ان کے بعد بنی اسرائیل میں ان کی جگہ پر یوشع ابن نون خلیفہ ہوئے اور تورات اور خدائی حکم کا بنی اسرائیل میں نفاذ کرتے رہے، یہانتک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھالیا، پھر اسی طرح کالب بن یوقنا خلیفہ ہوئے، پھر وہ بھی رحلت کر گئے تو حزقیل خلیفہ ہوئے یہانتک کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

ثم عظمت الاحداث فی بنی اسرائیل و نسوا عهد الله حتی عبدوا الاوثان فبعث الله الیهم الیاس نبیًا فدعاهم الی الله تعالیٰ وکانت الانبیاء من بنی اسرائیل بعد موسیٰ یبعثون الیهم بتجدید ما نسوامن التوراة ثم خلف من بعد الیاس الیسع فکان فیهم ماشاء الله ثم قبضه الله۔

اس کے بعد بنی اسرائیل میں طرح طرح کے واقعات پیدا ہو گئے اور انہوں نے خداوندی عہد کو بھلا دیا، یہاں تک کہ بت کی پوجا کرنے لگے تو حضرت الیاس کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا، تو انہوں نے ان کو خدا کی طرف دعوت دی اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو نبی بھی مبعوث ہوتے تھے، وہ تورات ہی کی تجدید کرتے تھے؛ الیاس علیہ السلام کے بعد الیسع خلیفہ ہوئے۔

Scanned with CamScanner

وخلف فيهم الخلوف وعظمت الخطايا فظهر لهم عدو يقال له البلثاثا وهم قوم جالوت كانوا يسكنون۔ ساحل بحر الروم بين مصر وفلسطين وهم العمالقة فظهروا على بني اسرائيل وغلبوا على كثير من ارضهم وسبوا كثيرا من ذراريهم وامروا من ابناء ملوكهم اربعمائة و اربعين غلامًا۔ فضربوا عليهم الجزية واخذ واتوراتهم و لقى بنو اسرائيل منهم بلاءً وشدة۔ ولم يكن لهم من يدبر امرهم وكان بسط النبوة قد هلكوا فلم يبق منهم الا امرأة حبلیٰ الخ

کچھ دنوں کے بعد جب اللہ نے ان کو اٹھالیا، اور ان کے بعد دوسرے خلفاء ہوئے اور ان میں بدکاریاں بڑھ گئیں۔ اس کے بعد ان کے دشمن رونما ہوئے جن کو بلثاثا کہا جاتا ہے۔ یہ جالوت کی قوم سے تھے جو مصر و فلسطین کے درمیان بحر روم کے ساحلی علاقہ میں رہتے تھے، اور وہ سب عمالقہ تھے بالآخر یہ لوگ بنی اسرائیل پر چڑھ آئے اور ان کی زمین کے اکثر حصہ پر غالب آگئے اور ان کی اولاد کی کثیر تعداد کو گرفتار کرلیا، اور شاہی خاندان کے چار سو چالیس نفوس کو قید کرلیا اور ان پر جزیہ قائم کردیا اور ان سے تورات چھین لیا اور بنی اسرائیل مصیبت اور شدت میں مبتلا ہوگئے۔ اور ان کے لئے کوئی شخص ایسا نہ رہا جو انکے (انفرادی اور اجتماعی) معاملات کو سنبھالتا اور خاندان نبوت کے لوگ سب کے سب ہلاک ہوگئے اور ان میں ایک حاملہ عورت کے سوا کوئی شخص باقی نہ رہا۔

حاصل یہ کہ بنی اسرائیل اس وقت قوم عمالقہ کے محکوم تھے اور ان کو جزیہ ادا کرتے تھے۔ ہر طرح کی شدت اور بلاؤں میں مبتلا تھے، ان کی جماعت میں کوئی شخص ایسا باقی نہیں رہا تھا جو ان کی اجتماعی زندگی کا سروسامان کرتا، اور غلامی اور محکومیت کے عذاب سے انکو نجات دلاتا۔ بدنصیبی کی انتہا یہ تھی کہ ان کے پاس خدا کی کتاب توراۃ بھی نہیں رہی تھی۔

اسی واقعہ کو صاحب تفسیر ابو سعودؒ نے ان الفاظ میں لکھا ہے:

ان جالوت راس العمالقه و ملكهم۔ وهو جابر من اولاد عمليق بن عادكان هو ومن معه من العمالقه يسكنون ساحل بحر الروم بين مصر وفلسطين فظهروا على بني اسرائيل واخذوا ديارهم وسبوا اولادهم واسروا من انبياء ملوكهم اربعمائة واربعين نفسًا فضربوا عليهم الجزية۔ واخذوا توراتهم۔ الخ

جالوت عمالقہ کا سردار اور بادشاہ تھا۔ اور عملیق بن عاد کی اولاد میں وہ بہت جابر تھا، یہ لوگ مصر و فلسطین کے درمیان بحر روم کے ساحلی مقامات میں رہتے تھے۔ یہ لوگ بنی اسرائیل پر غالب آگئے اور ان کے ملکوں پر قبضہ کرلیا اور ان کی اولاد کو گرفتار کرلیا اور شاہی خاندان کے چار سو چالیس سے زیادہ لوگوں کو قید کرلیا اور ان پر جزیہ نافذ کردیا اور ان سے تورات چھین لیا۔

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ بنی اسرائیل جالوت کے عہد حکومت میں محکومانہ زندگی بسر کررہے تھے، اور جزیہ نافذ کردیا گیا تھا۔ ان سے تورات چھین لی گئی تھی۔ ان کے ملک پر قبضہ کرلیا گیا تھا، ان کی اولاد قید کرلی گئی تھی، اور پورا شاہی خاندان زندان خانہ کا مہمان تھا۔ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

ان المعاصی كثرت فی بنی اسرائیل والخطایا عظمت فیهم ثم غلب علیهم عدو لهم كثیرا من ذراریهم فسألوا نبیهم ملكا تنتظم به كلمتهم ویجتمع به امرهم ویستقیم

بنی اسرائیل میں نافرمانیوں کی کثرت ہوگئی اور غلط کاریاں ان میں بہت بڑھ گئیں۔ اسکے بعد نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دشمن ان پر غالب ہوگئے اور بڑی تعداد میں ان کو قید کرلیا (جب وہ اس حال کو پہنچ گئے) تو بنی اسرائیل نے اپنے

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

حالهم فی جهاد عدو لهم وقیل تغلب جالوت علی بنی اسرائیل وکان قوام بنی اسرائیل بملک یجتمعون علیه یجاهد الاعداء ویجری الاحکام ونبی یطیعه الملک ویقیم امر دینهم ویأتیهم بالخبر عند ربهم۔ (تفسیر کبیر، ج:۲، ۴۳۲)

نبی سے ایک بادشاہ یعنی (امیر[۱] کے تقرر) کی درخواست کی جس سے ان کی پراگندگی دور ہو جائے اور جماعتی زندگی درست ہو جائے اور دشمنوں کے مقابلہ میں جہاد کرنے میں ان کے اندر استقامت رہے اور اس دشمن کے متعلق روایت کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر جالوت نے غلبہ حاصل کر لیا تھا اور دستور کے مطابق بنی اسرائیل کے کاموں کا مدار ایک تو امیر پر رہتا تھا جس پر وہ جمع ہوتے تھے اور وہ امیر دشمن سے جنگ اور ان میں اجراء احکام کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ دوسرے نبی پر جو ان کے دینی امور کی اقامت کرتے تھے اور خدا کی وحی کو ان تک پہنچاتے تھے، اور امیر ان کا مطیع رہتا تھا۔

---

[۱] ملکا کا ترجمہ ہم نے امیر کیا ہے، کیونکہ بنی اسرائیل نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس طرح کے والی کی درخواست کی تھی جو ان کے جماعتی امور کو ان کے دستور کے موافق انجام دیتا تھا۔ اور دشمنوں سے جنگ کے لئے فوجوں کو اپنی قیادت میں لے کر میدان جنگ میں جاتا تھا۔ ورنہ مطلق مطاع اور جملہ دینی امور کا نقطۂ مرکزی نبی کی ذات ہوتی تھی اور یہ والی مطیع ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے بھی ملکا کا ترجمہ امیر کیا ہے۔ مثلاً صاحب بیضاوی لکھتے ہیں:

ابعث لنا ملکاً نقاتل فی سبیل اللہ ای اقم لنا امیراً تنهض معه للقتال۔ یدبر امره ونصدر فیه عن رایه۔ (بیضاوی)

ابعث لنا ملکا الخ (کے معنی یہ ہیں کہ) لوگوں کے لئے ایک امیر کی اقامت فرما دیجئے کہ ہم اسکے ساتھ ہو کر جنگ کریں، وہ ہمارے معاملات جنگ کی تدبیر کرے اور اسی کی رائے سے ہم اس کام کو شروع کریں۔

علامہ ابوسعودؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ابعث لنا ملکاً نقاتل فی سبیل اللہ ای اقم لنا امیراً تنهض معه للقتال۔ یدبر امره ونصدر فیه عن رایه۔ (بیضاوی)

ابعث لنا ملکا کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے ساتھ جنگ کرنے کے لئے ایک امیر مقرر کر دیجئے کہ جنگی امور کی تدبیر کے بارے میں ہم اس کے مشورے سے کام شروع کریں۔

علامہ ابوسعودؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ابعث لنا ملکاً نقاتل فی سبیل اللہ ای انهض للقتال معنا امیرا نصدر فی تدبیر امر الحرب عن رایه۔ (برحاشیہ تفسیر کبیر)

ابعث لنا ملکاً کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے ساتھ جنگ کرنے کے لئے ایک امیر مقرر کر دیجئے کہ جنگی امور کی تدبیر کے بارے میں ہم اس کے مشورے سے کام شروع کریں۔

اسی طرح علامہ زمخشری نے بھی ملکا کا ترجمہ امیر ہی کیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

ابعث لنا ملکا انهض للقتال معنا امیراً نصدر فی تدبیر الحرب عن رایه وننتهی الی امره (کشاف)

ابعث لنا ملکا الخ (کے معنی یہ ہیں) ہمارے جنگ کرنے کیلئے ایک امیر مقرر کر دیجئے کہ جنگی امور کی تدبیر کے بارے میں ہم اس کے مشورہ سے شروع کریں اور ختم کریں۔

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ بنی اسرائیل[۱] اپنے دشمنوں سے مغلوب تھے، نہ ان کے اندر اجتماعی زندگی باقی رہی تھی نہ ان میں انتظام کلمہ تھا، یعنی اس وقت یہ لوگ کسی امیر کے ساتھ وابستہ نہ تھے۔ ایسی حالت میں انہوں نے اپنے عہد کے نبی سے درخواست کی کہ ہمارے لئے امیر کا تقرر فرما دیجئے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں دستور یہ تھا کہ ان کے اجتماعی امور بذریعہ امیر کے انجام پاتے تھے۔ اور امیر نبی کی رہنمائی میں کام کرتا تھا۔ (حاشیہ صفحہ ۳۵ پر)

Scanned with CamScanner

اسی کی طرف امام رازیؒ نے ملک کی درخواست کے مقصد کو بیان کر کے اشارہ کیا ہے کہ ملک سے مراد ایسی ذات تھی جس سے ان کے کلمہ کا انتظام ہوجائے اور ان کے معاملات کے اندر اجتماعی کیفیت پیدا ہوجائے اور دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے میں ان کے اندر استقامت کی شان رہے۔ لیکن یہ ملک مختار مطلق نہیں ہوتا تھا بلکہ نبی کا تابع ہوتا تھا اور نبی ہی کی رہنمائی میں کام کرتا تھا؛ لیکن بنی اسرائیل کے دستور کے مطابق اس زمانہ میں رواج تھا کہ نبی کے علاوہ متذکرہ امور کی انجام دہی کے لئے ان کا ایک امیر ہوتا تھا، مقصد اس حاشیہ کا یہ ہے کہ لفظ ملکا کا اطلاق یہاں ایسی ذات پر نہیں کیا گیا ہے جو اقتدار اعلیٰ کا مالک ہوتا ہے اور سب اسی کے تابع ہوتے ہیں جس کی تعبیر اردو میں بادشاہ سے کرتے ہیں کیونکہ یہاں ملک نبی کے تابع ہوتا تھا اور اقتدار اعلیٰ نبی کے ہاتھ میں تھا۔ اور سیاست ربانی کا مادی اور روحانی حیثیت سے نبی ہی کی ذات نقطہ مطاع ہوتی تھی ۱۲ عبدالصمد رحمانی۔

ل اس دستور ورواج کا جس کا ذکر امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے اور مفسرین نے بھی لکھا ہے اور اس میں کسی مفسر کا اختلاف نہیں ہے۔ مثلاً صاحب معالم التنزیل لکھتے ہیں:۔

وانماکان قوام امر بنی اسرائیل با لاجتماع علی الملوک وطاعة الملوک لانبیاء هم فکان الملک هوالذی یسیر بالجموع۔ والنبی یقیم له امره و یشیر علیه برشده ویاتیه بالخبر من ربه۔ (معالم التنزیل، ص:۱۴۰، مطبوعہ ہند)

بنی اسرائیل کے معاملات کا یہ دستور تھا کہ انکا اجتماع ملوک پر ہوتا تھا اور ملوک انبیاء کی اطاعت کرتے تھے اس لئے ان کا جو بادشاہ یعنی (امیر) ہوتا وہ جماعت کی نگرانی کی خدمت انجام دیتا تھا اور نبی بادشاہ (یعنی امیر) کے معاملے کی نگرانی اور اقامت کرتے اور ان کی رہنمائی کرتے تھے اور خدا کے احکام کو ان تک پہنچاتے تھے۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:

وانما کان قوام امر بنی اسرائیل بالاجتماع علی الملوک وطاعة الملوک لانبیاء هم فکان الملک هوالذی یسیر بالجموع و النبی یقیم امره ویشیر علیه برشده ویاتیه بالخبر من عند ربه۔ (روح المعانی، ص:۲۵۸)

بنی اسرائیل کا پادشاہوں پر مجتمع ہونا اور بادشاہ کا نبی کی اطاعت کرنا بنی اسرائیل کے دستور زندگی میں تھا۔ بس بادشاہ جماعتی امور کے ساتھ وابستہ رہتا اور نبی اس بادشاہ کے معاملات کی درستگی کرتے اور اس کی رہنمائی فرماتے اور خدا کی وحی کو ان تک پہنچاتے۔

اسی طرح علامہ خازن رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وانما کان قوام امر بنی اسرائیل بالاجتماع علی الملوک وطاعة الملوک لانبیاء هم فکان الملک هوالذی یسیر بالجموع و النبی هوالذی یقیم له امره ویشیر علیه وبرشده ویاتیه بالخبر من ربه۔ (تفسیر خازن، ص:۲۱۴)

بنی اسرائیل کی جماعتی زندگی کی تشکیل یوں تھی کہ انکا براہ راست تعلق بادشاہ سے رہتا اور بادشاہ نبی کی اطاعت کرتا اور بادشاہ جماعتی کاموں میں لگا رہتا اور نبی بادشاہ کے معاملہ کی درستگی کرتا اور اس کو مشورہ دیتا اور اس کی ہدایت کرتا اور احکام خداوندی ان کو پہنچاتا۔

پھر بنی اسرائیل میں اس دستور کے ساتھ نبوت اور ملوکیت کے متعلق خاندانوں کی تخصیص بھی چلی آتی تھی، اسی بنا پر حضرت طالوت کی ملوکیت پر ابتداً ان کو اعتراض بھی ہوا تھا کہ یہ اس کے مستحق نہیں ہیں، علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

وانما قالوا ذٰلک لان النبوة کانت فی سبط لاویؑ بن یعقوب والملک فی سبط یهودا ولم یکن طالوت فی احد السبطین۔ (کشاف، ص:۱۴۸)

ان لوگوں نے یہ اس لئے کہا کہ نبوت لاوی ابن یعقوب کے خاندان میں تھی اور ملوکیت یہودا کے خاندان میں تھی اور طالوت ان دونوں خاندانوں میں سے کسی سے نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اس کے متعلق ''مصر'' کے زمانہ حال کے مشہور و معروف فلسفی اور مفکر، مؤرخ اور مفسر علامہ شیخ طنطاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر ''جواہر'' میں (جو عہد حاضر کی ''تفسیر کبیر'' ہے اور جس کو مشرق و مغرب دونوں جگہ یکساں طور پر قبول عام حاصل ہے اور جامعہ دار السلام عمر آباد نے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کر دیا ہے) تفصیل سے لکھا ہے۔ اس جگہ بہ نظر اختصار بقدر حاجت کچھ عبارت بلفظہ ہم اسی ترجمہ سے نقل کر دیتے ہیں؛ تا کہ ان ارباب فکر کے لئے بھی وجہ تسکین ہو جو ہر چیز کو آجکل کے فلاسفر اور مؤرخ کی زبان اور قلم سے سننا اور پڑھنا چاہتے ہیں۔

جب حزقیل نبی کا انتقال ہو چکا تو سالہا سال تک بنی اسرائیل کی قوم بالکل پراگندہ حالت میں رہی، ان کا کوئی باقاعدہ نظام نہ تھا۔ اس لئے ان کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاسؑ کو جن کا ذکر ''سورۂ صافات'' میں ہے، بھیجا۔ پھر حضرت الیاس کے بعد حضرت یوشعؑ تشریف لائے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد پھر نبی اسرائیل کی قوم گمراہ ہو گئی۔ اس کا سارا نظام بگڑ گیا۔ اس وقت ایک دشمن ظاہر ہوا جس کو بلطا ثا کہتے ہیں۔ یہ شخص قوم جالوت سے تھا جو اس زمانہ میں مصر اور فلسطین کے درمیان سواحل بحر روم پر زندگی بسر کرتی تھی۔ اسی قوم کو عمالقہ بھی کہا جاتا ہے۔ بلطا ثا نے تمام بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا لیا۔ اور بنی اسرائیل غلامی اور ذلت کا طوق پہن کر بلطا ثا اور اس کی قوم کے باج گذار ہو گئے۔ اب بنی اسرائیل میں کوئی ایسا گھر نہیں تھا؛ جس میں نبی پیدا ہو سکے۔ صرف ایک بوڑھی عورت کا گھر باقی رہا تھا جس کو ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس کا نام شموئیل رکھا گیا۔ آگے چل کر یہی بچہ نبی ہوا۔ جب جالوت اور عمالقہ نے بہت زیادہ سرکشی اور ظلم و ستم کرنا شروع کیا، تو نبی اسرائیل نے شموئیل سے درخواست کی کہ ان پر کوئی بادشاہ (یعنی باصطلاح فقہاء امیر) مقرر کر دیں تا کہ اس کے ماتحت رہ کر دشمنوں سے مقابلہ کریں۔ چنانچہ اس طرف اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اشارہ فرمایا **ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل اللہ** الخ اسی کے بعد نبی اسرائیل کا نیا زمانہ اور ان کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔

(تفسیر جواہر علامہ طنطاوی مصری ص ۵۰۳ ج ۱)

اس کا بھی حاصل یہی ہے کہ ''تمام بنی اسرائیل قوم عمالقہ کے غلام اور اس کے باج گذار تھے اور طرح ذلیل تھے۔ اپنے ملک کے اندر بے بسی کی غلامانہ زندگی بسر کر رہے تھے، اس بے بسی کی طرف **وقد اخرجنا من دیارنا و ابنائنا** کے تحت میں حضرت علامہ خازن بغدادی نے اپنی تفسیر مؤلفہ ۷۲۵ھ میں ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:۔

ومعنی الآیۃ انھم قالوا لنبیھم انا انما کنا ترکنا الجھاد لانا کنا ممنو عین فی بلادنا لایظھر علینا عدونا فاما اذا بلغ ذٰلک منا فنطیع ربنا فی جھاد عدونا ونمنع نساء نا و اولادنا۔

(تفسیر خازن، ج:۱ص: ۲۱۴)

آیت کے معنی یہ ہیں کہ بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم لوگوں نے جہاد کو اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ ہم لوگ اپنے شہروں میں محفوظ تھے اور ہم پر ہمارے دشمن غالب نہ تھے؛ لیکن ایسی حالت میں کہ ہم لوگوں کو یہ مصیبت پہنچ چکی ہے (یعنی اپنے شہروں میں محفوظ بھی نہیں ہیں اور دشمن کا غلبہ بھی ہو چکا ہے) تو اب ہم جہاد کے معاملہ میں اپنے پروردگار کی اطاعت کریں گے اور اپنی عورتوں کو اور اپنی اولاد کو محفوظ حالت میں لے آئیں گے۔

تفسیر ابن جریر طبری جو متداول تفسیروں میں ہے سب سے زیادہ قدیم اور لائق اعتماد ہے۔ اس تصریح کے بعد کہ:

قال ابن اسحق فکان من حدیثھم فیما حدثنی بہ اھل العلم عن وھب ابن منبہ انہ الخ

ابن اسحٰق نے کہا کہ بنی اسرائیل کے واقعات میں سے بعض اہل علم نے وہب ابن منبہ سے جو روایت کی ہے یہ ہے:۔

بنی اسرائیل کی بے بسی کے متعلق یہ لکھا ہے کہ:

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

فلم يزل ذلك البلاء بهم حتى قالوا له ابعث لنا ملكا نقاتل فى سبيل الله فقال لهم انه ليس عندكم وفاء ولا صدق ولا رغبة فى الجهاد فقالوا انما كنا نهاب الجهاد ونزهد فيه انا كنا ممنوعين فى بلادنا لايطاها احد فلايظهر علينا عدوفا ما اذا بلغ ذلك فانه لابدمن الجهاد فنطيع ربنا فى جهاد عدونا ونمنع ابنائنا ونسائنا وذرارينا۔ (ج:۲،ص:۳۴۵)

بنی اسرائیل برابر بلاؤں میں مبتلا رہے یہاں تک کہ ان لوگوں نے نبی سے کہا، ہمارے لئے بادشاہ (یعنی امیر) مقرر کر دیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں تو نبی نے انسے کہا کہ تم لوگوں میں نہ تو وفاء ہے، نہ سچائی ہے، نہ جہاد کی رغبت ہے۔ اس پر ان لوگوں نے جواب دیا کہ بیشک ہم جہاد سے ڈرتے تھے اور اس میں قصور کرتے تھے، اس لئے کہ ہم اپنے شہروں میں محفوظ تھے اور کوئی اس میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور ہمارے دشمن ہم پر غالب نہ تھے، لیکن جب یہ سب مصیبتیں ہم کو پہنچ چکیں تو جہاد ہمارے لئے ضروری ہو گیا۔ لہٰذا ہم دشمنوں کے جہاد میں اپنے پروردگار کی اطاعت کریں گے اور اپنے اہل وعیال کو محفوظ حالت میں کرلیں گے۔

یہی واقعہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ۭ (البقرہ:۱۴۷)

(اے پیغمبر) کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں کی سرگذشت پر غور نہیں کیا جنہوں نے موسیٰ کے بعد اپنے نبی سے کہا ہمارے لئے ایک پادشاہ (یعنی امیر) کا تقرر کر دیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ نبی نے کہا تم کو جنگ کا حکم ہو گیا تو شاید نہ لڑو گے، ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اب کیا عذر ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں جبکہ ہم اپنے بال بچوں سے اور اپنے گھروں سے نکالے جا چکے ہیں۔

بنی اسرائیل اور ان کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوال وجواب کے بعد جو قرآن مجید میں مذکور ہوا، کیا ہوا؟ اور نبی اسرائیل کے موجودہ نبی نے ان کے لئے کس امیر کا تقرر کیا؟ اور نبی اسرائیل نے ان کو کس طرح قبول کیا؟ قرآن مجید نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارے لئے پادشاہ (یعنی امیر) مقرر کیا ہے، تو وہ بول اٹھے کہ ہم پر اس کی پادشاہی (یعنی امارت) کیسے ہو سکتی ہے؛ حالانکہ ہم اس کی نسبت پادشاہی کے زیادہ حقدار ہیں اور اس کو مال کی فراخی نہیں دی گئی ہے، نبی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی کو تم پر حکومت کے لئے پسند کیا ہے اور علم اور جسم میں اس کو بہت بڑھایا ہے۔

(البقرہ:۲۴۷)

اس واقعہ میں قطع نظر اور امور کے جن کی بحث اگلے صفحات میں آئے گی۔ یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حضرت طالوت کا تقرر بحیثیت امیر ہوا تھا، جو انتظام کلمہ اور تدبیر امور کا مرکز ہوتا ہے اور اجتماعی زندگی کی سازگاری اور کامرانی کے لئے نقطہ مطاع ہوتا ہے، اور اسی کی بنی اسرائیل کو ضرورت تھی۔ اور یہ تقرر ایسی حالت میں ہوا تھا کہ بنی اسرائیل حکومت کافرہ کے ماتحت دار الکفر میں محکومانہ زندگی گذار رہے تھے، مغلوب تھے۔ اور ناچار ومجبور تھے۔ ہر طرح کی شدت اور بلا میں گھرے ہوئے تھے، ان کے ملک پر دشمنوں کا قبضہ تھا اور یہ رعایا کی حیثیت سے ان کو جزیہ ادا کرتے تھے، ان کی اولاد قید کر لی گئی تھی اور پورا شاہی خاندان جیل خانہ میں ڈالدیا گیا تھا۔ ان کے اندر نہ اجتماعی زندگی باقی رہی تھی نہ انتظام کلمہ تھا۔ نہ کسی امیر کے ساتھ وابستگی تھی۔ اگرچہ نبی کی ذات بابرکات ان میں موجود تھی۔ کیونکہ بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

ے عہد طالوت تک، نبوت وامارت دو الگ الگ شعبے تھے اس پر تورات اور تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ پھر یہ تقرر نبی نے کیا تھا، اور نبی کا یہ تقرر خدا کی پسندیدگی سے تھا، گویا دارالکفر میں قیام امارت اور نصب امیر کا مسئلہ ایسا مسئلہ تھا جس پر خدا اور رسول دونوں کی مہر تھی، اور آج بھی بمصداقِ **فبهُداهم اقتده** قرآن مجید کا منصوص مسئلہ ہے۔ **فکفی باللہ شهيدا۔**

مسئلہ امارت

احادیث نبویؐ کی روشنی میں

تقرر امیر کی تشکیل کی بحث سے پہلے مسئلہ امارت کو ہم احادیث نبوی کی روشنی میں بھی دیکھ لینا چاہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے طرز زندگی کے متعلق کیا ہدایات دی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم دو قسم کی حدیثوں کا ذکر کریں گے۔ اول تو ایسی حدیثیں جن سے یہ معلوم ہوگا کہ اسلامی زندگی، اجتماعی زندگی کا نام ہے، اور مسلمانوں پر جماعتی زندگی گذارنا واجب قرار دیا گیا ہے، جو مستلزم امارت ہے۔ دوسرے ایسی حدیثوں کا ذکر کریں گے؛ جس میں امارت اور امیر کا ذکر صراحۃً مذکور ہو، اور اپنے مفہوم کے اعتبار سے دارالاسلام کے ساتھ مخصوص نہ ہو۔ آخر میں امارت کے متعلق ایک ایسی حدیث اور زمانۂ نبوت کا ایک ایسا واقعہ پیش کریں گے جس کو خصوصیت کے ساتھ دارالکفر سے تعلق ہو۔ اور ایسی حدیثوں سے بالقصد ہم قطع نظر کریں گے جن کو خصوصیت کے ساتھ دارالاسلام سے یا قیام خلافت سے، یا تقرر سلطان سے تعلق ہوتا کہ بحث طویل نہ ہو۔

(۱) اسلام اور التزام جماعت

(الف) انا امركم بخمس الله امرنی بهن الجماعة والسمع والطاعة والهجرة والجهاد فی سبيل الله فانه من خرج من الجماعة قيد شبرفقد خلع ربقة الاسلام من عنقه الاان يراجع

میں تم کو پانچ باتوں کا حکم کرتا ہوں جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے مجھ کو دیا ہے۔ ۱۔ جماعت، ۲۔ سمع، ۳۔ اطاعت، ۴۔ ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر الگ ہوا، تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ومن دعا بدعوی جاهلية فهو من جثی جهنم۔ قالوا یا رسول الله وان صام وصلی قال وان صلی وصام وزعم انه مسلم۔

(اخرجه احمد والحاکم علی شرط الصحیحین)

دیا اور جس نے جاہلیت کی زندگی (یعنی افتراق وانتشار) کی دعوت دی تو اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ لوگوں نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ اگرچہ یہ شخص روزہ رکھتا ہو۔ نماز پڑھتا ہو، حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں اگرچہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو، اور اپنے زعم میں اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔

اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ مسلمان کے لئے سب سے مقدم چیز ''جماعتی زندگی'' ہے۔ دوسری یہ کہ جماعتی زندگی کا ترک۔ اسلامی زندگی کا ترک ہے جس کی تعبیر ترجمان وحی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ فرمائی کہ ''جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا، تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔'' تیسری یہ کہ جماعتی زندگی سے علیحدگی کی جو دعوت دیتے ہیں وہ جاہلیت کی زندگی کی طرف بلاتے ہیں جس کا انجام کار جہنم ہے۔ چوتھی یہ کہ جماعتی زندگی سے کٹ کر زندگی گذارنے والوں کے لئے اس میں سخت وعید ہے کہ ایسی حالت میں نہ صرف نماز وروزہ باعث نجات ہو سکتے ہیں۔ نہ اس کا اپنے کو مسلمان کہنا اور سمجھنا عذاب جہنم سے نجات دلا سکتا ہے۔ پانچویں یہ کہ جماعتی زندگی میں داخل ہونے کے بعد اس کا فریضہ جماعتی احکام اور فرمان کو سننا اور قبول کرنا ہے۔ چھٹی یہ کہ جماعتی فرمان واحکام کی کامل درجہ اطاعت کرنی اور اس کی تعمیل کرنی جماعتی زندگی کا فریضہ ہے۔ ساتویں یہ کہ جماعتی مقصد کے حصول کے لئے ہر طرح کے ایثار وقربانی کرنی چاہیے، چاہے اس راہ میں تفاوت احوال کی بنا پر ہجرت وجہاد ہی کا موقع امتحان کیوں نہ پیش آجائے۔

اس حدیث میں قابل توجہ اہم بات یہ ہے کہ سب سے پہلے اس حکم کے بعد کے مسلمانوں کو خدا کا حکم یہ ہے کہ وہ جماعتی زندگی گذاریں۔ معاً یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ان پر ''سمع

وطاعت'' واجب ہے یہ دلیل اس امر کی ہے کہ جماعت کے لئے امیر کا ہونا شرعاً ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ اس لئے بغیر ذکر امیر وامام کے معاً جماعت کے بعد سمع وطاعت کا ذکر فرمایا گیا کیونکہ قیام جماعت، امارت وامامت کے فوائد وثمرات، سمع وطاعت سے مترتب ہو سکتے ہیں، اور اس حدیث شریف میں اس امر کو مطلقاً بیان کیا گیا ہے یعنی عام از یں کہ مسلمان دارالاسلام میں بستے ہوں یا دار الکفر میں بہر حال وہ اقامت جماعت کے مکلف ہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا اعلان خلیفہ دوئم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس مشہور قول میں گذر چکا ہے کہ:

لا اسلام الا بجماعة ولا جماعة الّا بامارة ولا امارة الا بطاعة۔

اسلامی زندگی نہیں ہو سکتی ہے بغیر جماعتی زندگی کے اور جماعتی زندگی نہیں ہو سکتی ہے بغیر امارت کے اور امارت کا مدار طاعت امیر پر ہے (یعنی امیر کی اطاعت واجب ہے)

پھر جماعتی زندگی جو بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ امارت کی شرعی تعبیر ہے، اسکی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے یہی اسلامی زندگی ہے۔ یہ اعلان فرمایا کہ جس نے جماعتی زندگی سے اپنے کو نکال لیا، اس نے اسلام کے حلقہ کو اپنی گردن سے نکال دیا۔ اور جو اس سے علیٰحدہ رہا اور علیٰحدگی کی دعوت دیتا رہا۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہے، اگرچہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔ پس بغیر وابستگی امیر جس طرح کی بھی زندگی ہوگی؛ وہ اسلامی اور جماعتی زندگی نہیں ہوگی۔

(ب) عن ابی هريرة، سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات ميتةً جاهلية۔

(رواہ مسلم، ج:۲، ص:۱۲۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ حضور فرماتے تھے کہ جو شخص اطاعت سے علیٰحدہ ہو جائے گا اور جماعت کو چھوڑ دیگا۔ وہ جاہلیت کی موت مریگا۔

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

یعنی افتراق، بے قیدی اور جماعت سے علیحدگی، اسلامی زندگی نہیں ہے، بلکہ یہ جاہلیت کی زندگی ہے؛ جس میں لوگ اسلام سے پیشتر بحالت کفر مبتلا تھے؛ یعنی ان کے لئے کوئی امیر اور امام مطاع نہ تھا۔ جاہلیت کی موت سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ کافر ہو کر مرے گا، بلکہ مراد یہ ہے کہ جماعتی زندگی سے بے تعلقی کے بنا پر وہ گنہگار اور عاصی مریگا۔ فتح الباری میں ہے:۔

والمراد بالميتة الجاهلية وهي بكسر الميم حالة الموت كموت اهل الجاهلية على ضلال وليس له امام مطاع؛ لانه كانوا لايعرفون ذلك. وليس المراد يموت كافرا بل يموت عاصيا۔ (فتح الباری، ص: ۵-۲۱۳)	میتۃ جاہلیت جو بکسر میم ہے، اس سے مراد موت ہے، یعنی مثل موت اہل جاہلیت کے (یعنی قبل زمانہ رسالت محمدیہ کے) گمراہی پر ایسی حالت میں کہ ان کے لئے کوئی امام مطاع نہ تھا؛ کیونکہ اہل جاہلیت امامت وامارت کو نہیں جانتے تھے۔ اور یہ مراد نہیں ہے کہ کافر مرا؛ بلکہ مراد یہ ہے کہ گنہگار مرا۔

حاصل یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد "**مات ميتة جاهلية**" کا مطلب یہ ہے کہ بغیر امیر وامام کے زندگی گذارنی، گمراہی کی زندگی اور جاہلی زندگی ہے، اور اسی حالت میں مرنا، جاہلیت کی موت مرنا ہے۔ یعنی ضلالت وگمراہی اور معصیت پر مرنا ہے؛ کیونکہ اسلامی زندگی جماعتی زندگی کا نام ہے، زندگی جو شارع کا مطلوب ومقصود ہے، وہ ایسی جماعتی زندگی ہے جس کا کوئی امیر وامام ہو، یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول میں ہے کہ "**لااسلام الا بجماعة**" اسلامی زندگی صرف جماعتی زندگی کا نام ہے، اور جماعتی زندگی صرف وہ زندگی ہے، جو کسی امیر کی اطاعت میں گذاری جائے اس کے خلاف جو زندگی ہوگی، وہ ایسی اسلامی زندگی نہیں ہوگی، جو شارع علیہ السلام کا مطلوب ومقصود ہے۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ جو جماعتی زندگی سے متعلق نہیں ہوگا، اس کا اسلام سے تعلق نہیں رہیگا، وہ کافر ہو جائیگا۔ حدیث شریف کے لفظ "**ميتة جاهلية**" اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول

"**لا اسلام الا بجماعة**" سے ایسا سمجھنا کہ اس میں خروج عن الاسلام یا کافرانہ موت کا ایہام ہے۔ حدیث اور اقوال صحابہ سے بدذوقی ہوگی، کیونکہ جماعتی زندگی سے بے تعلقی کی بنا پر نہ سلف نے حدیث اور آثار صحابہ سے یہ سمجھا اور نہ خلف کو اس کا الہام ہوا؛ بلکہ جس طرح سلف نے جماعتی زندگی سے بے تعلقی کو عاصیانہ زندگی سمجھا اور لکھا؛ اسی طرح خلف نے بھی جماعتی زندگی سے بے تعلقی کو عاصیانہ زندگی سمجھا اور لکھا، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس کلکتہ کے خطبۂ صدارت میں ہے۔

"مسلمانوں کی حقیقی جوہری تنظیم وہی ہے جو آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے قائم کی گئی تھی۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر ایسے ملک میں جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں۔ اکثریت بھی نہیں ایک امارت یا امامت قائم کی جائے، خاص قواعد شرعی کے ساتھ انتخاب ہو اس کے لئے ایک مجلس شوریٰ ہو، اور تمام فرد اس کے ہاتھ میں شرعی بیعت کریں اور اس کے ہر شرعی حکم کو ایک حکومت کی طرح واجب العمل سمجھیں، جس کا مخالف مذہباً عاصی اور گنہگار اور ملت کے رشتہ سے کٹ جانے والا ہوگا" (ص ۱۵۰)

اسی طرح حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خطبہ جزیرۃ العرب میں لکھا ہے اور نہایت واضح طور پر یہ بتایا ہے کہ جماعتی زندگی سے بے تعلقی کو یعنی انفرادی زندگی کو اسلام، اسلامی زندگی نہیں مانتا، خطبہ کے الفاظ یہ ہیں:

"آگے چل کر کثرت سے وہ حدیثیں ملیں گی، جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی ہوئی اور سمٹی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو۔ اور کسی امیر کے تابع نہ ہو۔ اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی نہیں مانتا، اسلامی زندگی جماعت ہے۔"

اسی طرح **ميتة جاهلية** کے تحت لکھا ہے "اسلام سے پہلے اہل عرب پر جو زمانہ گذرا ہے، اس کو عہد جاہلیت کہتے ہیں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ عرب جاہلیت کی طرح گمراہی پر موت ہوئی۔"

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اسی طرح ایک اور جگہ لکھا ہے:

''شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام اسلام رکھا ہے۔ اور جماعت سے علیٰحدگی کو جاہلیت اور حیات جاہلیت سے تعبیر کیا ہے، جیسا کہ آگے بالتفصیل آئے گا ''**من فارق الجماعة مات ميتة جاهلية وغير ذلک**'' اور اسی بنا پر بکثرت وہ احادیث و آثار موجود ہیں جن میں نہایت شدت کے ساتھ ہر مسلمان کو ہر حال میں التزام جماعت اور اطاعت امیر کا حکم دیا گیا۔

اسی طرح ایک اور جگہ ہے:

پس جاہلیت کا دوسرا نام تفرقہ ہوا اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور اطاعت امام سے الگ ہو گیا، گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ اسکی موت اسلام پر نہیں، بلکہ جاہلیت پر ہوگی۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو۔ روزہ رکھتا ہو اور اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔

(ج) **(عن ابن عباس) ليس احد يفارق الجماعة شبرا فيموت الامات ميتة جاهلية۔**

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہو جائیگا اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

(بخاری کتاب الاحکام)

اس حدیث میں ''فارق الجماعة'' نہیں ہے بلکہ '**يفارق الجماعة شبرا**' ہے، یعنی جاہلیت کی موت کی وعید محض اس کے لئے نہیں ہے جو بالکلیہ جماعت سے الگ ہو گیا ہو؛ بلکہ اسکے لئے بھی ہے جو جماعتی زندگی سے بالشت بھر بھی الگ ہو گیا ہو؛ یعنی اگر کوئی شخص امیر کے بعض احکام میں اطاعت کرے اور بعض احکام میں اطاعت نہ کرے، اگرچہ وہ حکم جس میں اطاعت نہ کرے، نصوص شرعیہ کے خلاف نہ ہو۔ یہ صورت ہے ایک بالشت جماعت سے الگ ہونیکی، اسی کے ہم معنی حدیث ترمذی شریف میں بھی ہے:

(د) **من فارق الجماعة شبرا فكانما خلع ربقة الاسلام من عنقه۔**

جو شخص ایک بالشت بھر بھی جماعت سے الگ ہوا اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔

(ہ) **(عن معاذ بن جبل) قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الشيطان ذئب الانسان كذئب الغنم ياخذ الشاة القاصية والناصية واياكم والشعاب وعليكم بالجماعة والعامة۔** (رواہ احمد)

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شیطان انسان کا بھیڑیا ہے، بکری کے بھیڑیے کی طرح جو تنہا بکری کو پکڑ لیتا ہے (اس لیے) اپنے کو ٹولی ٹولی بنانے سے بچاؤ اور جماعت کو اور سب لوگوں کے ساتھ مل کر رہنے کو لازم سمجھو۔

اس حدیث میں التزام جماعت کی تاکید، اور وجوب کے ساتھ افتراق وتشتت کی زندگی کو موجب ہلاکت فرمایا گیا ہے، اور یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جو آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔

(و) **(عن انس رضی اللہ عنہ) اتقوا الله واصلحوا ذات بينكم اى الحالة التى يقع بها الاجتماع والائتلاف۔**

(سراج منیر، ج:۱، ص:۳۷)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی حالتوں کی ایسی اصلاح کرو، یعنی وہ حالت اختیار کرو، جس سے اجتماع اور ائتلاف پیدا ہو اور وہ حالت قیام امارت شرعیہ ہی سے ہو سکتی ہے۔

(ز) **قال النبى صلى الله عليه وسلم ان الله يرضى لكم ثلثاً ان تعبدوه ولاتشركوا به شيئا وان تعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا ان تناصحوا من ولاه الله امركم ۔**

(رواہ مسلم)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تم سے تین باتوں کو پسند کرتا ہے؛ اول یہ کہ اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ دوسرے یہ کہ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور ٹولی ٹولی نہ بنو؛ تیسرے یہ کہ خدا نے جس کو تمہارا والی بنایا ہو۔ اس کی خیر خواہی کرو۔

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

ح) ید اللہ علی الجماعۃ ومن شذ شذ فی النار۔

اللہ تعالیٰ کی (مدد) کا ہاتھ جماعت پر ہے اور جو شخص جماعت سے علیحدہ ہوا وہ آگ میں ڈالا گیا۔ (ابن ماجہ)

ان احادیث کی روشنی میں یہ چیز واضح ہوگئی کہ ہر مسلمان کے لئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم یہ ہے کہ وہ جماعتی زندگی گذارے، جماعتی زندگی کا ترک، اسلامی زندگی کا ترک ہے۔ جماعتی زندگی سے الگ ہو کر انفرادی زندگی گذارنا جاہلیت کی فوضویت کی زندگی ہے: جس کی موت انفرادی زندگی پر ہوگی اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی، اسلامی زندگی کی موت نہیں ہوگی اور اس کے اس طرح کے خاتمہ کو یہ نہیں کہا جائیگا کہ مسلمانوں کے جیسی اس کی موت ہوئی؛ کیونکہ اس کی نظر میں انتشار اور فوضویت کی زندگی پسندیدہ نہیں ہے؛ بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک مسلمانوں کے لئے پسندیدہ امر یہ ہے کہ وہ ایک امیر، ایک امام کے ساتھ وابستہ ہو کر زندگی گذاریں؛ کیونکہ اسی کا نام شریعت الٰہی میں جماعتی زندگی ہے۔

جماعتی زندگی کی نوعیت: اس سلسلہ میں یہ چیز سمجھ لینے کی ہے کہ آیا جماعتی زندگی جو اسلام کا مطلوب و مقصود ہے، اس کا نام ہے کہ باہم مل کر تفریح کے لئے ایک کلب بنالیں اور وہاں فرصت کے اوقات میں جمع ہو جائیں یا باہم ایک ورزش گاہ بنالیں، جہاں صبح و شام جمع ہو کر ورزش کرلیا کریں۔ یا اصلاحی نام پر کوئی انجمن بنالیں؟ اور باہمی مشورہ سے اس کے متعینہ و مفروضہ مقاصد کو انجام دیا کریں یا کوئی کمیٹی کسی خاص مقصد کے لئے ترتیب دیں اور اس کے ذریعہ اس مقصد کو عملی جامہ پہنائیں یا کوئی انجمن یا لیگ اپنے خانہ ساز اصول پر وضع کرلیں اور اس کے ذریعہ باہم مل کر مسلمانوں کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی مفاد کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں وغیرہ وغیرہ، اور اگر یہ جملہ صورتیں یا اس طرح کی اور جو بھی جماعتی شکلیں ممکن ہیں، اسلامی نقطہ نظر سے اس اجتماعی زندگی کا مصداق نہیں: جو اسلام کا مطلوب و مقصود ہے تو پھر وہ کیا صورت ہے جس کو **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا** (سب مل کر اللہ کی ڈوری کو مضبوط پکڑو

اور جدا جدا نہ ہو) سے خدا، اور **علیکم بالجماعۃ رواہ احمد** (اپنے اوپر جماعت کو لازم پکڑو) سے خدا کے رسول ﷺ کا مطالبہ ہے اور جس کے متعلق فارق الجماعۃ کی حدیث میں "جماعۃ" کی علیحدگی پر وعید ہے تو اس کا حل بالکل صاف اور واضح ہے کہ لفظ جماعۃ کے مفہوم و مراد شرعی کو سمجھنے کے لئے ہم کو شارع علیہ السلام کی طرف رجوع کرنا چاہئے کہ آپ نے لفظ جماعت کا اطلاق کس طرح کے اجتماع پر کیا ہے اور علیکم بالجماعۃ کا حکم کس طریق اجتماع کے متعلق ارشاد فرمایا ہے؛ یا لفظ جماعۃ کے اطلاق کے ساتھ لزومی حیثیت سے کیا چیز اس کے مفہوم میں آپ کے پیش نظر رہی ہے۔

اس سلسلہ میں تعیین مراد کے لئے واضح ارشاد حضرت ابودرداءؓ کی وہ حدیث ہے جس میں نماز کے اندر انفرادی صورت اختیار کرنے سے ممانعت فرمانے کے بعد "علیک بالجماعۃ" آپ نے ارشاد فرمایا ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی درداء قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مامن ثلثۃ فی قریۃ ولابدو ولاتقام فیھم الصلوٰۃ الا قد استحوذ علیھم الشیطان فعلیک بالجماعۃ فانما یاکل الذئب القاصیۃ رواہ احمد وابوداؤد والنسائی۔

حضرت ابودرداءؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین آدمی چاہے گاؤں میں ہوں یا صحرا میں ہوں، جب ان میں جماعت سے نماز پڑھی جائیگی شیطان ان پر غالب آجائے گا۔ اس لئے اپنے اوپر جماعت کو لازم کرو؛ اس لئے کہ بھیڑیا الگ رہنے والی بکری کو کھا جاتا ہے۔

یعنی الگ الگ منفرد ہو کر نماز نہ پڑھو؛ بلکہ جماعت کو لازم کرلو، یعنی امام کے پیچھے سب اقتدا کرو اور اپنی نماز کے لئے امام بنالو، جو سب کا مرکز ہو، وہ جب تک کھڑا رہے، سب کھڑے رہیں، وہ جب رکوع میں جائے تو سب رکوع میں چلے جائیں، اور جب وہ سجدہ میں زمین پر سر رکھ دے تو سب اسکی اقتدا میں اپنی پیشانی کو خاک پر رکھ دیں پھر جب وہ بیٹھے تو سب بیٹھ جائیں، اور جب وہ کھڑا ہو تو سب کھڑے ہو جائیں۔

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

یعنی نماز کے اندر جماعتی شان کو لازم پکڑنے کے معنیٰ یہ ہوئے کہ ایک امام کے تابع ہو کر نماز پڑھو۔ یہ نہیں کہ ایک جگہ جمع ہو کر جس طرح بھی ہو نماز ادا کر لو حاصل یہ کہ ''علیکم بالجماعۃ'' سے شارع علیہ السلام کا مطلوب و مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی ایک امام کے تابع ہو۔ ایک امیر ان کا مرکز حیات ہو، اور ان کی جماعتی زندگی کی عنان اس کے ہاتھ میں ہو۔

اصطلاح شارع علیہ السلام میں جس طرح ''صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، حج وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو لغوی معنی سے کچھ زیادہ خصوصیات اپنے اندر رکھتے ہیں؛ اسی طرح لفظ جماعت کے مفہوم میں شارع علیہ السلام کے نزدیک لغوی معنیٰ سے کچھ زیادہ خصوصیات ہیں، یعنی جس طرح صلوٰۃ کے لغوی معنیٰ دعاء کے ہیں، مگر شارع علیہ السلام کی اصطلاح میں اس کے اندر رکوع، سجود، قیام، قعود، داخل ہیں۔ اور شرعاً صلوٰۃ کے معنیٰ سے رکوع، سجود، قیام، قعود کے مفہوم کو نہیں نکال سکتے ہیں؛ اسی طرح شرعاً جماعت کے لغوی معنی میں جو محض اجتماع کے ہیں، شارع علیہ السلام کی اصطلاح میں اس میں امام کا مفہوم داخل ہے، اور شرعاً جماعت کے معنی سے امام کے مفہوم کو نہیں نکال سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حدیثوں میں امام و جماعت کے اندر اس طرح کا لزوم برتا گیا ہے کہ امیر کی مخالفت اور امیر سے علیحدگی کو، جماعت کی مخالفت اور علیحدگی قرار دی گئی ہے اور اس پر ملامت کی گئی ہے، زجر کیا گیا ہے، وعید فرمائی گئی ہے مثلاً مسلم شریف کی حدیث ہے:

عن عرفجة قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من اتاكم وامركم جميع على رجل واحد يريد ان يشق عصاكم اويفارق جماعتكم فاقتلوه۔

حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول ﷺ سے سنا، حضور فرماتے تھے، جو شخص تمہارے پاس آئے ایسی حالت میں کہ تمہارا امر ایک شخص پر مجتمع ہو، وہ چاہے کہ تمہاری جماعت میں پھوٹ ڈالے تو اس کو قتل کر ڈالو۔

ایک دوسری بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث میں ہے:

عن ابن عباس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من راى من اميره شيئا يكرهه فليصبرفانه ليس احديفارق الجماعة شبرا فيموت الامات ميتة جاهلية۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے امیر میں ناپسندیدہ امر پائے تو اس کو صبر کرنا چاہئے؛ اس لئے کہ جو شخص جماعت سے بالشت بھر الگ ہوگا اور اسی پر مرجائے گا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

ایک اور حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے مسلم شریف میں ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابي هريرة قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات ميتة جاهلية۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا حضور صلعم فرماتے ہیں کہ جو شخص امام کی اطاعت سے نکلا اور جماعت کو چھوڑ دیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

پہلی حدیث میں جماعت کی مخالفت کو امیر کی مخالفت قرار دی گئی ہے اور حکم فرمایا گیا ہے کہ اس کو قتل کر دو۔ جس طرح امیر کی مخالفت میں قتل کر دینے کا حکم ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مسلم شریف میں روایت ہے:

عن عبدالله ابن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من بايع اماما فاعطاه صفقة يده وثرة قلبه فيطعه ان استطاع فان جاء آخر ينازعه فاضربوا عنق الاخر۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی امام کی بیعت کی اور اپنے ہاتھ کے اختیار اور دل کی ارادت کو اس کے سپرد کر دیا تو چاہئے کہ بقدر استطاعت اس کی اطاعت کرے، اس کے بعد اگر کوئی دوسرا شخص اس سے جھگڑا کرے تو اس کی گردن مار دو۔

دوسری حدیث میں امیر کے ناپسندیدہ امر پر صبر کا حکم فرمایا گیا ہے اور اس سے علیحدگی اور ترک تعلق کو منع فرمایا گیا ہے، اور دلیل یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ ایسا کرو گے تو یہ جماعت کی علیحدگی اور جماعت کے ترک تعلق کو مستلزم ہوگا اور جماعت سے تفریق اور جماعت سے الگ ہو کر زندگی گزارنا اور اس پر مرنا، جاہلیت کی موت ہے۔

تیسری حدیث میں بھی امام کی اطاعت سے خروج کو جماعت سے خروج فرمایا گیا ہے اور اس زندگی پر ملامت کی گئی ہے۔

حاصل بحث: بہرحال جماعت کے مفہوم میں شرعاً امام داخل ہے۔ شارع علیہ السلام کے اس مطالبہ کے معنیٰ کہ جماعتی زندگی اختیار کرو، اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنی زندگی ایک امیر کی ماتحتی میں گزارو، اور شرعی امور میں اپنی زندگی کے عنان کو اس کے ہاتھ میں دیدو اور امام کی اتباع کرو۔

کیونکہ ایسی زندگی، کہ مسلمان ہوں، مگر شرعی طریق پر ایک امام کے ساتھ ان کی وابستگی نہ ہو تو وہ چاہے جس طرح بھی آپس میں مل جل کر رہتے ہوں، شریعت میں ان کا نام جتھابندی، دھڑابندی اور فرقہ بندی ہے؛ جس سے علیحدگی اور ترک کا حکم ہے اور اس میں قول فیصل حضرت حذیفہؓ کی وہ متفق علیہ حدیث ہے جسے بخاری و مسلم دونوں نے روایت کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

قلت: یارسول الله! انا کنا فی جاهلیة و شر فجآءنا الله بهذا الخیر فهل بعد هذا الخیر من شر قال: نعم قلت: وهل بعد ذلک الشر من خیر قال: نعم- وفیه دخن قلت: وما دخنه قال: قوم یستنون بغیر

(حضرت حذیفہ کہتے ہیں) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم عرب جہالت اور برائی میں مبتلا تھے۔ اللہ اسلام کی یہ بھلائی لایا تو کیا اس بھلائی کے بعد پھر برائی آئے گی، ارشاد ہوا: ہاں، پھر عرض کیا، کیا اس برائی کے بعد بھلائی آئے گی۔ فرمایا: ہاں اور اس میں کچھ بگاڑ ہوگا عرض کیا: وہ بگاڑ کیا ہوگا۔ فرمایا: کچھ ایسے لوگ ہوں گے

سنتی ویهدون بغیر هدی تعرف منهم وتنکر قلت: فهل بعد ذالک الخیر من شر قال: نعم دعاة علی ابواب جهنم من اجابهم الیها قذفوه فیها قلت: یا رسول الله! صفهم لنا قال: هم من جلدتنا ویتکلمون بالسنتنا قلت: فما تأمرنی ان ادرکنی ذلک قال: تلزم جماعة المسلمین وامامهم- قلت: فان لم یکن لهم جماعة ولا امام قال: فاعتزل تلک الفرق کلها-

جو میرے طریقہ کے خلاف چلیں گے، اور میری روش کے خلاف ان کی روش ہوگی، تم ان میں اچھی بات بھی پاؤ گے اور بری بات بھی پاؤ گے پھر عرض کیا کہ کیا اس اچھائی کے بعد برائی آوے گی۔ فرمایا "ہاں" بہت سے داعی پیدا ہوں گے جو جہنم کے دروازے کی طرف بلائیں گے جو ان کی بات کو مانے گا وہ اس کو جہنم میں پہنچا دیں گے عرض کیا: یارسول اللہ! ان کی صفت بیان فرمایئے، ارشاد ہوا، وہ ہماری ہی قوم کے ہوں گے، عرض کیا حضور اگر یہ زمانہ مجھ کو پالے تو میرے لئے کیا حکم ہے؟ فرمایا: مسلمانوں کی جماعت کو اور اس کے امام کو لازم پکڑو۔ عرض کیا کہ اگر مسلمانوں کی جماعت اور ان کا امام نہ ہو تو کیا حکم ہے؟ تو فرمایا کہ ان سب فرقوں کو چھوڑ کر ان سے الگ ہو جاؤ۔

حاصل یہ کہ حضور ﷺ حضرت حذیفہؓ سے فرماتے ہیں کہ ایسے فتنہ وشر کے زمانہ میں کہ اعلانیہ جہنم کی دعوت دی جاتی ہو، اور عام گمراہی کا شیوع ہو، مسلمانوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے امام کے ساتھ وابستہ ہو کر جماعتی زندگی میں اپنے کو منسلک رکھیں۔ اور اگر بدنصیبی سے ان کے لئے کوئی امام اور جماعتی زندگی کا کوئی سروسامان جو شریعت کا مطلوب ومقصود ہے، نہ ہو تو پھر جتنی ٹولیاں بھی ہوں وہ سب اسلامی نقطہ نظر سے فرقے ہیں، جماعت نہیں ہیں؛ جس سے الگ ہو کر زندگی بسر کرنا چاہئے اور ان فرقوں کو چھوڑ دینا چاہئے کہ یہ شریعت الٰہیہ کے مطلوب ومقصود نہیں ہیں۔

Scanned with CamScanner

جو گروہ بغیر امیر کے ہو وہ شرعاً جماعت نہیں: یہ حدیث جس طرح اس امر پر روشن دلیل ہے کہ امت مسلمہ میں مختلف قسم کے "دعاۃ" ہوں گے جو اپنے مخترعات کی طرف مسلمانوں کو دعوت دیں گے، جن کو امام و امیر سے وابستگی نہیں ہوگی وہ سب شارع علیہ السلام کی نگاہ میں فرقے ہیں، بھیڑ ہیں، انبوہ ہیں، گروہ ہیں، شرعی معنی میں جماعت نہیں ہیں، اس پر بھی واضح برہان ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی کاموں کے لئے امام کا ہونا ضروری ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی یہ وہ واضح حقیقت ہے جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حقیقت شناس بصیرت نے سمجھا اور اپنے مشہور قول میں اعلان کیا اور امت مسلمہ کی رہنمائی فرمائی ہے کہ

لا اسلام الا بجماعة ولا جماعة الا بامارة ولا امارة الا بطاعة (جامع ابن عبدالبر ص: ۶۲)

اسلامی زندگی نہیں ہو سکتی ہے، بغیر جماعتی زندگی کے اور جماعتی زندگی نہیں ہو سکتی ہے بغیر امارت کے اور امارت کا مدار اطاعت پر ہے۔

(۲)

اسلام اور قیام امارت

(۱) عن علی قال لا یصلح الناس الا امیرٌ برٌ او فاجرٌ۔ (کنز العمال)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کی اصلاح امیر ہی کر سکتا ہے چاہے وہ نیکوکار ہو یا فاجر۔

(۲) اذا اراد اللّٰہ بقوم خیرًا ولی علیهم حلماء هم۔ (عن مہران ابن مرانع الامیر قال المناوی اسنادہ جید)

جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو ان پر اسی قوم کے حلیم اور بردبار لوگوں کو والی بناتا ہے۔

(۳) من استطاع منکم ان لا ینام نومًا ولا یصبح صبحًا الا وعلیه امام فلیفعل۔ (ابن عساکر عن ابن سعید و ابن عمر)

تم میں سے جو شخص اس کی طاقت رکھتا ہو کہ نہ (کسی رات کو) سوئے۔ اور نہ کوئی صبح گذارے، لیکن ایسی حالت میں کہ اس پر کوئی امام (مقرر) ہو تو ایسا ہی کرلے۔

(۴) عن مسلم بن عامر قال: سمعت ابا امامة يقول رسول الله صلى الله عليه وسلم: يخطب فی حجة الوداع فقال: اتقوا الله وصلوا خمسكم وصوموا شهركم وادوا زكوٰة اموالكم واطيعوا اذا امرتم تدخلوا جنة ربكم۔ (فتح القدیر کتاب الزکوٰۃ)

مسلم بن عامر روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابو امامہ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے پس آپ نے فرمایا کہ (مسلمانوں) اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور پانچوں وقتوں کی نمازیں پڑھا کرو اور شہر رمضان میں روزہ رکھا کرو اور اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرو اور جب تم کسی کو امیر بناؤ تو اطاعت و فرمانبرداری کیا کرو، نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

(۵) عن ابی سعید ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اذا خرج ثلاثة فی سفر فليؤمروا عليهم احدهم۔ (رواه ابوداؤد)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تین شخص بھی سفر میں جائیں تو لازم ہے کہ ان تین میں سے ایک کو اپنے لئے امیر بنالیں۔

ان احادیث میں قیام امارت اور اطاعت امیر کے متعلق جو ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہ اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ محتاج تشریح نہیں۔

ہر شخص بلا تردد ترجمہ ہی پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا حاصل یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ انسانی صلاح و فلاح کا مدار امیر پر ہے جو جماعتی زندگی کا مرکز و مطاع ہوتا ہے۔ کسی قوم میں بردبار امیر کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ مشیت الٰہی اس قوم کے متعلق خیر کا ارادہ رکھتی ہے، اس لئے سرکار رسالت کا فیصلہ یہ ہے کہ تمہاری زندگی کا کوئی دن اور تمہاری حیات کی کوئی رات ایسی نہ گذرے کہ تمہارا کوئی امام نہ ہو یہاں تک کہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں جب کہ آپ کے رکاب میں ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ کھڑے تھے اور آپ اپنا تاریخی آخری خطبہ اور پیام قیامت تک کے لئے امت کو دے رہے تھے تو اس وقت بھی آپ نے نماز،

Scanned with CamScanner

روزہ، زکوٰۃ کی ادائیگی کے ساتھ امیر کی اطاعت کا حکم فرمایا اور بشارت دی کہ اگر تم ایسا کرلو گے تو جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ پھر جس طرح اس حدیث میں اطاعت امیر پر جنت کی بشارت ہے، دوسری حدیثوں میں امیر کی نافرمانی پر سخت زجر اور ملامت ہے۔ مثلاً ارشاد ہے:

من يطع الامير فقد اطاعني ومن يعص الامير فقد عصاني (متفق علیہ)

جس نے میرے امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی، اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی، میری نافرمانی کی، سنو اور اطاعت کرو۔ اگرچہ حبشی غلام ہی تم پر کیوں نہ مقرر کیا گیا ہو۔

اسمعوا واطيعوا وان استعمل عليكم عبدٌ حبشي۔ (بخاری)

من رای من امیرہ شیئا یکرھہ فلیصبر فانہ لیس احد یفارق الجماعۃ فیموت الامات میتۃ جاھلیۃ۔ (متفق علیہ)

تم میں سے جو کوئی اپنے امیر میں کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو صبر کرے؛ کیونکہ کوئی شخص جماعت سے اگر ایک بالشت بھر بھی علیحدہ ہو جائے اور اسی حالت میں مرجائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

ادّوا اليهم حقهم وسلوا الله حقكُمْ۔ (متفق علیہ)

امیر کو امیر کا حق ادا کرو، اور اپنے حق کا سوال اللہ کی جناب سے کرو۔

اسمعوا واطيعوا فانما عليهم ما حملوا وعليكم ما حملتم۔ (مسلم)

سنو اور اطاعت کرو اس لئے کہ انکے (یعنی امیروں کے) ذمہ وہ چیزیں ہیں جو ان کی ذمہ داری میں ڈالی گئی ہیں، اور تمہاری ذمہ داری میں وہ چیزیں ہیں جو تمہاری ذمہ داری میں ڈالی گئی ہیں۔

من خلع يدًا من طاعةٍ لقى الله يوم القيامة ولا حجة له ومن مات وليس فى عنقه بيعة مات ميتة جاهلية۔ (مسلم)

جو شخص اطاعت سے اپنے ہاتھ کو کھینچے گا قیامت کے دن اللہ کے حضور میں اس طرح حاضر ہوگا کہ اسکے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی اور جو شخص اس حال میں مریگا، اس کی گردن میں بیعت کا طوق نہ ہو، تو وہ جاہلیت کی موت مریگا۔

یہ احادیث اطاعت امیر کے وجوب پر جس طرح کھلی دلیلیں ہیں۔ اس امر پر بھی نص ہیں اور کھلی شہادت ہیں کہ امیر سے مراد عام ہے، اور تمام انواع کے امراء امت کو شامل ہے، اور ان کی اطاعت امت پر واجب ہے۔ ان احادیث میں امیر کا لفظ محض امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کے معنی میں نہیں ہے اور نہ کسی اہل علم نے ایسا سمجھا ہے، اور نہ ایسا سمجھنا صحیح ہو سکتا ہے؛ کیونکہ حضور ﷺ کی حیات میں جتنے امیر تھے اور جن کی اطاعت کو حضور اپنی اطاعت اور جن کی نافرمانی کو حضور اپنی نافرمانی قرار دیتے رہے ہیں۔ وہ امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین نہ تھے؛ بلکہ مختلف صوبہ اور خطے کے امیر تھے اور سب کے مرکز مطاع حضور ﷺ تھے اور اس میں وہ امیر بھی داخل ہیں جو دارالاسلام کے وجود میں آنے سے پہلے آپ کے امیر تھے، یعنی جب آپ مکی زندگی گذار رہے تھے اور آپ ان کے متعلق بیعت لیتے تھے؛ جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت ہے کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات پر بیعت کی کہ ہم لوگ راحت والم ہر حال میں سمع وطاعت کریں گے اور امیر سے امارت کے بارے میں جھگڑا نہ کریں گے۔ علامہ عینیؒ نے لکھا ہے یہ بیعت عقبہ ثانیہ میں ہوئی تھی۔

ہاں یہ لفظ اپنے عام مفہوم کے اعتبار سے حضور ﷺ کے بعد امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کو بھی شامل ہے۔

اسی طرح کسی حدیث سے اس کی تخصیص نہیں معلوم ہوتی ہے کہ امیر ہونے کی صرف یہی صورت ہے کہ اس کو خود ذات رسالت ﷺ امیر بنائیں؛ بلکہ ذیل کی ترمذی شریف کی حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ خود قوم کا امیر بنانا جائز ہے۔ اور اس کی اطاعت واجب ہے، ارشاد ہے:

عن مسلم بن عامر قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يخطب فى حجة الوداع فقال: اتقو الله وصلوا خمسكم وصوموا شهركم وادوا زكوٰة اموالكم واطيعوا اذا امّرتم تدخلوا جنة ربكم۔ رواه الترمذی۔ (فتح القدیر)

حضرت مسلم بن عامر روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا؛ مسلمانو! اللہ سے ڈرو۔ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھا کرو اپنے مہینہ رمضان کے روزے رکھو، اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کیا کرو اور جب تم کسی کو امیر بناؤ تو اطاعت کرو (اگر تم نے اس پر عمل کرلیا تو) جنت میں داخل ہوگے۔

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

(۳)

اسلام اور امارت فی دار الکفر

دار الکفر میں مسلمانوں کا اپنے شرعی معاملات اور مذہبی زندگی کے لئے امیر بنانا اور سمع وطاعت سے کام لینا، ایسا مسئلہ ہے کہ صدر کے نصوص کی بنا پر جو قرآن وحدیث سے ہم پیش کر چکے ہیں اہل علم کے طبقہ میں اس کے متعلق نہ کبھی کوئی تردد رہا نہ کبھی کوئی سوال پیدا ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ فقہ کی چھوٹی سے چھوٹی کتاب، اور بڑی سے بڑی کتاب میں بغیر کسی اختلاف کے قیام امارت اور تقرر امیر کو واجب لکھا ہے؛ پھر یہ نہیں کہ اس کی تصریح محض فقہاء حنفیہ کے یہاں پائی جاتی ہے؛ بلکہ جملہ ائمہ کے یہاں قیام امیر کے متعلق یہ تصریحات پائی جاتی ہیں۔

ان کے سامنے ان تمام نصوص کی بنا پر نہ کبھی یہ سوال پیدا ہوا کہ ان میں دار الکفر کا نام نہیں پایا جاتا ہے اور نہ کبھی یہ شبہ ہوا کہ ان کو فقط دار الاسلام سے تعلق ہے، نہ کسی اہل علم کو اس کا خطرہ ہوسکتا ہے، اس لئے کہ حضور کی بعثت، اور قرآن کا نزول اگر عرب اور عربوں اور عہد نبوی کے انسانوں کے لئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ عرب وعجم اور تمام سفید وسیاہ اقوام کے لئے ہے، اور قیامت تک کے لئے ہے۔ تو یہ ماننا پڑے گا کہ جو شخص جہاں بھی اسلام کا کلمہ پڑھتا ہے۔ وہ وہیں مسلمان ہے اور وہیں اس پر خدا اور اس کے رسول کے احکام کی بجا آوری بھی فرض ہے اور ہمیشہ فرض رہے گی۔

پس جس طرح نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ایمان، شہادت، نکاح، طلاق، طہارت، نجاست اور دیگر احکام کی مخاطبت میں عرب اور افریقہ، یورپ اور ایشیا کے جملہ مسلمان ایک حیثیت رکھتے، اسی طرح جماعت اور نظام شرعی کے التزام اور افتراق وتشتت سے بیزاری کے حکم میں بھی جملہ مسلمان ایک حیثیت رکھتے ہیں۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا کے مخاطب جس طرح عرب کے مسلمان تھے اور آج بھی ہیں، اسی طرح ہندوستان کے مسلمان بھی اس کے مخاطب آج سے پہلے تھے اور اس وقت بھی ہیں۔ علیکم بالجماعۃ کا فرمان اپنے اندر جو حیثیت لزومی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بھی آج سے پہلے رکھتا تھا اور آج بھی رکھتا ہے۔ تشتت اور افتراق، پراگندگی اور بے قیدی کی زندگی جس طرح عربوں کے لئے شریعت کی نظر میں حیات جاہلیت تھی اور ہے۔ اسی طرح یہ امور مسلمانان ہند کے لئے بھی ہمیشہ سے جاہلیت کی زندگی کا باعث تھی اور ہے۔

پس اگر آج سے تیرہ سو برس پہلے کے مسلمانوں کے لئے جماعتی زندگی شریعت کی نگاہ میں لازمی چیز تھی، تو وہ آج بھی مسلمانوں کے لئے لازمی چیز ہے اور قیامت تک لازمی رہے گی، چاہے وہ عرب میں بستے ہوں یا افریقہ میں، یورپ میں رہتے ہوں یا ایشیا میں۔ پھر ایشیائی ہونے کی حیثیت سے وہ مصر وایران میں ہوں یا ہندوستان میں۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ احوال اور ظروف کے لحاظ سے شریعت نے یہ ضرور رعایت دی ہے کہ وہ اپنے پیروؤں کو تکلیف مالا یطاق میں مبتلا نہیں کرتا ہے۔ وہ جس طرح دار الاسلام میں ایک مجبور کمزور مریض کو اس کے لئے نہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ باوجود عدم استطاعت کے رمضان کا روزہ رکھے یا جنابت کا غسل کرے یا کھڑے ہو کر نماز پڑھے یا میدان جنگ میں جہاد کے لئے جائے یا قاضی کے اجلاس میں حاضر ہو کر شہادت دے وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح وہ دار الکفر میں اس کے لئے بھی مجبور نہیں کرتا ہے کہ باوجود عدم استطاعت کے وہ زانی کو سنگسار کرے، دُرے مارے، چور کے ہاتھ کاٹے، قاذف پر حد جاری کرے وغیرہ وغیرہ۔

اگرچہ اس کا یہ فریضہ ہے کہ وہ کمزوری کا علاج کر کے ایسی استطاعت اور فضا حاصل کرنے کی سعی کرے، جس سے تمام احکام شرعی نافذ ہوسکیں، لیکن جب تک استطاعت حاصل نہ ہو اس وقت تک اس قسم کے احکام کے علاوہ دیگر امور جو اس کی استطاعت میں ہوں، وہ چاہے دار الکفر میں ہوں، یا دار الاسلام میں، وہ عند اللہ مامور ہے، چاہے وہ نماز وروزہ اور حج وزکوٰۃ کا مسئلہ ہو یا نکاح وطلاق اور طہارت ونجاست کا مسئلہ ہو یا جماعتی زندگی یا قیام امارت اور تقرر امیر کا مسئلہ ہو۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ببرحال ان ہی نصوص کی بنا پر جن کی وجہ سے جماعتی زندگی کا التزام دارالاسلام میں مسلمانوں پر واجب اور لازم ہے۔ دارالکفر میں بھی ہر مسلمان پر جماعتی زندگی کا التزام لازم اور واجب ہے ان اشخاص پر اتمام حجت کے لئے جو بدقسمتی سے اغراض فاسدہ کے ماتحت ہر ایسے مسئلہ میں جس کا مسلمانوں کی جماعتی زندگی اور نظام شرعی سے تعلق ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ اختلاف اور تفریق اور جدل و اعتراض کے لئے آستینیں چڑھا چڑھا کر مسلمانوں کو گمراہی میں ڈالنے کے عادی رہے ہیں، چند ایسی حدیثوں کو پیش کر دینا چاہتے ہیں، جو اس فساد کی رگ میں فصد کا کام دیدے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہم مسند امام احمد بن حنبل کی حدیث پیش کرنا چاہتے ہیں، جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

(۱) لایحل لثلثة یکونوا بفلاة من الارض الا امروا علیهم احدهم الخ۔

ایسے تین شخصوں کے لئے جو زمین کے کسی گوشہ میں زندگی گذارتے ہوں، حلال نہیں ہے، مگر یہ کہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالیں۔

اس حدیث میں ''بفلاة من الارض'' کے الفاظ اس امر پر صریح دلیل ہیں کہ یہ حکم کسی خاص جغرافیائی حدود کے لئے مخصوص نہیں ہے؛ بلکہ تمام اقطاع عالم کے لئے عام ہے اور ہر ایسی جگہ کے لئے جہاں تین مسلمان بھی ہوں، حضورؐ کا حکم ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں۔

(۲) دوسری حدیث بخاری شریف کی پیش کرتا ہوں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امارت پر بیعت لینا اس وقت سے ثابت ہے، جب دنیا کا ہر چپہ دارالکفر تھا، اور اسلام کے لئے یہ بستی اور دنیا کا کوئی گوشہ دارالاسلام نہیں تھا۔

علامہ عینی کا اس بیعت کے متعلق بیان ہے کہ:

کان هذا فی بیعة العقبة الثانیة وقال ابن اسحق وکانوا فی عقبة الثانیة ثلثة وسبعین رجلا من الاوس والخزرج وامرأتین۔

یہ واقعہ بیعت عقبہ ثانیہ کا ہے ابن اسحٰق کا قول ہے کہ یہ لوگ قبیلہ اوس و خزرج کے تہتر (۷۳) مرد اور عورتیں تھیں۔

(عمدۃ القاری، ص: ۲۲۳، جلد ۱۷)

یہ بیعت عقبہ ثانیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں انصار کرام رضی اللہ عنہم سے ہجرت سے پہلے لیا تھا اور اس وقت مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ عرب کے ریگستان میں وہ اطمینان کا سانس بھی نہیں لے سکتے تھے۔ وحی الٰہی نے اس حالت کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ۔ (الانفال:۲۶)

یاد کرو جب تم ملک میں تھوڑے تھے، اور کمزور تھے، اور ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو اچک نہ لیں۔

لیکن پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیہم تبلیغ اور قبائل عرب کے سامنے ایام حج میں اسلام کو پیش کرنے کے باعث، آفتاب اسلام کی کرنیں دور دور تک پہنچ چکی تھیں۔ یمن میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا خاندان اور طفیل بن عمرو دوسی کا پورا قبیلہ مسلمان ہو چکا تھا، ازدشنوہ کا پورا قبیلہ حضرت ضماد بن ثعلبہ کے ہاتھ پر مسلمان ہو چکا تھا، غفار کا نصف قبیلہ حضرت ابوذر غفاریؓ کے ہاتھ پر مسلمان ہو چکا تھا اور ان ہی کے اثر سے اسلم کا قبیلہ جو قبیلہ غفار کے قریب ہی تھا وہ بھی مسلمان ہو چکے تھے، اسی طرح اور قبائل میں بھی اسلام پہونچ چکا تھا اور مہاجرین حبش کے واسطہ سے اسلام کی آواز غیر قوموں تک پہنچ چکی تھی اور مدینہ منورہ کے قبائل اوس و خزرج کی معتدبہ جماعت نے اسلام قبول کر لیا تھا اور حضورؐ کے مدینہ تشریف لانے کے پہلے، سوا دو تین گھرانوں کے بقیہ تقریباً تمام مدینہ منورہ کے گھرانے مسلمان ہو چکے تھے۔

پھر بھی مسلمانوں کی بیکسی کا حال یہ تھا کہ بجز چوری چھپے نہ کھلے ہجرت کر سکتے تھے، نہ کہیں چین سے بے خطر ہو کر اللہ کا نام لے سکتے تھے، خود مدینہ کا، جہاں سب سے زیادہ مسلمانوں کی تعداد تھی اور انصار کے علاوہ مہاجرین کی بہت بڑی تعداد موجود تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کر کے تشریف لے آنے کے بعد بھی یہ حال تھا کہ راتوں کو جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے نسائی شریف میں ہے:

Scanned with CamScanner

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اول ماقدم المدينة يسهر من الليل۔

آنحضرت ﷺ اول جب مدینہ تشریف لائے توراتوں کو جاگا کرتے تھے۔

حاکم کی روایت ہے کہ

لما قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم واصحابه المدينة وآوتهم الانصار رمتهم العرب عن قوس واحدة وكانوا لايبيتون الا بالسلاح ولا يصبحون الا فيه۔

جب آنحضرت ﷺ اور آپ کے اصحاب کرام مدینہ منورہ تشریف لائے اور انصار نے ان کو پناہ دی تو تمام عرب متحد ہو کر ایک ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کیلئے آمادہ ہوگیا۔ صحابہ کرام کا یہ حال تھا کہ ہتھیار باندھے ہوئے رات گذارتے تھے اور ہتھیار باندھے ہوئے صبح کرتے تھے۔

راتوں کو باری باری صحابہ حضور ﷺ کا پہرہ دیتے تھے اور ان سب کی وجہ یہ تھی کہ مکہ کی مصیبت جو ایک نوعیت کی تھی وہ مدینہ میں متعدد اور گوناگوں بن گئی تھی۔ ایک تو منافقین مارآستین تھے، دوسرے یہود دشمن تھے جو صاحب اقتدار تھے اور قلعوں میں رہا کرتے تھے اور تجارت وسودخواری کے سبب مالدار تھے۔ اس کے علاوہ بیرونی حملے کے خطرات ہر وقت دامنگیر تھے۔

مگر اس حال میں بھی جماعتی زندگی جو اسلامی زندگی کی دوسری تعبیر ہے، ہمیشہ پیش نظر رہتی تھی اور اپنی بیعت کے وقت امیر کے لئے بھی یہ اقرار لیتے تھے کہ امارت کے بارے میں تنازع اور جھگڑا نہیں کریں گے اور مکہ کا دارالکفر ہونا، اس عہد اقرار کے لئے مانع نہیں ہوتا تھا۔

بخاری شریف کے الفاظ یہ ہیں:

عن عبادة بن الصامت قال: بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على السمع والطاعة فى المنشط والمكره وان لاننازع الامر اهله وان نقوم اونقول بالحق حيث ما كنا لانخاف فى الله لومة لائم۔ (کتاب الاحکام)

حضرت عبادہؓ بن صامت سے روایت ہے کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات پر بیعت کی کہ ہم لوگ راحت والم ہر حال میں سمع و طاعت بجالائیں گے؛ یعنی فراخی وتنگی میں بھی آپکی بات سنیں گے اور فرمانبرداری کرینگے اور امیر سے امارت کے بارے میں جھگڑا نہیں کرینگے اور جہاں کہیں رہیں گے، حق کا اظہار کریں گے اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ کریں گے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ ان اطراف واکناف میں جہاں اسلام کے پرستار پھیلے ہوئے تھے، امراء کا تقرر فرماتے تھے اور ان کے بارے میں ہر شخص سے عہد لیتے تھے اور ان کا دارالکفر میں ہونا تقرر امیر کے لئے مانع نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ مہاجرین حبش کے امیر حضرت جعفرؓ تھے؛ حالانکہ حبش دارالحرب تھا اور وہاں کا بادشاہ نصرانی تھا۔ یہ واقعہ سیرت ابن ہشام میں مذکور ہے۔

(۳) تیسری حدیث دارالکفر میں تقرر امیر کی دلیل میں بخاری شریف کی وہ حدیث ہے جس میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے امیر ہونے کا تذکرہ ہے۔ اور یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا، جب کہ اسلامی فوج علاقہ شام میں جو ہنوز فتح نہیں ہوا تھا۔ غزوۂ موتہ میں برسر جنگ تھی اور تین شخص یکے بعد دیگرے امیر کی حیثیت سے جنکی تقرری خود ذات رسالت نے فرمائی تھی، شہید ہوچکے تھے۔ اسکے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ کو باوجود اس کے کہ حضورؐ نے ان کی امارت کی تقرری نہیں کی تھی، مسلمانوں کی جماعت نے امیر منتخب کیا تھا۔ بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

Scanned with CamScanner

عن انس بن مالك قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اخذ الراية زيد فاصيب ثم اخذ ها جعفر فاصيب ثم اخذها جعفر فاصيب ثم اخذها عبدالله بن رواحة فاصيب وان عيني رسول الله صلى الله عليه وسلم لتذرفان ثم اخذها خالد بن وليد من غير امرة ففتح له۔ (بخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اسلامی جھنڈا (علم امیر الجیش) کو زید بن حارثؓ نے لیا پس وہ شہید ہوگئے، پھر اس علم کو حضرت عبداللہ بن رواحہ نے لیا، وہ بھی شہید ہوگئے (اس واقعہ کو جس وقت رسول ﷺ بیان فرمارہے تھے آپکی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے) پھر اس علم کو حضرت خالد بن ولید نے لیا حالانکہ دربار رسالت سے امیر نہیں بنائے گئے تھے پس ان کو فتح حاصل ہوئی۔

اس حدیث کو بخاری نے متعدد ابواب میں اسی طرح اختصار سے بیان کیا ہے، اور اس کی پوری تفصیل فتح الباری جلد (۷) ص ۳۹۳ تا ص ۳۹۴ میں مذکور ہے اور یہ بھی تصریح کردی ہے کہ من غیر امرۃ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حضرت خالد بغیر اس کے کہ قوم نے ان کو امیر منتخب کیا ہو، خود سے امیر بن گئے تھے؛ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت خالد کی امارت آنحضرت ﷺ سے منصوص نہیں تھی، فتح الباری کے الفاظ یہ ہیں:۔

والمراد نفي كونه كان منصوصًا عليه والافقد ثبت انهم اتفقوا عليه۔ (ص:۳۹۴، ج:۷)

من غیر امرۃ سے مقصود یہ ہے کہ حضرت خالد کی امارت منصوص علیہ نہ تھی یعنی رسول اللہ ﷺ نے ان کو امیر نہیں بنایا تھا؛ جس طرح ان تین اصحاب کو امیر بنایا تھا، ورنہ مطلب صحیح نہ ہوگا؛ کیونکہ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ واقعہ یہ تھا کہ قوم نے انکی امارت پر اتفاق کیا تھا۔

یہ حدیث اس امر پر صریح دلیل ہے کہ دار الکفر میں امیر کا انتخاب قوم کے ذمہ ہے۔

اور کسی حالت میں بھی مسلمانوں کی جماعت کو بغیر امیر کے رہنا جائز نہیں ہے؛ حتی کہ میدان جنگ میں بھی انتخاب امیر کی ضرورت لاحق ہوجائے تو انتخاب کرلینا چاہئے؛ کیونکہ اسلامی زندگی کا یہ لازمی شعار ہے اور مسلمان اس کا مامور ہے۔

پھر یہ واقعہ اس حیثیت سے کہ جب اسلامی فوج شام سے واپس آئی اور حضور ﷺ نے نہ تو قوم کے اس انتخاب کو ناجائز ٹھہرایا، نہ کراہت کا اظہار فرمایا اور بھی زیادہ مستند ہوجاتا ہے، اور دارالحرب میں انتخاب امیر کے مسئلہ کی تصویب براہ راست دربار رسالت سے ہوجاتی ہے، چاہے وہ امیر الجیش ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو۔

(۴) اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ہم ایک واقعہ اور لکھدینا چاہتے ہیں؛ جو اپنی جگہ پر دارلکفر میں امارت شرعیہ کی پوری نظیر ہے۔ اور تمثیل کے خوگر حضرات کی تسکین وطمانیت کے لئے سب سے بہتر دلیل ہے اور وہ واقعہ یمامہ ہے۔

واقعہ یمامہ | عہد رسالت کے آخری زمانہ میں جب یمامہ میں اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور بہت سے لوگ اس کے متبع ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ کے والی قتل کردیئے گئے۔ بہت سے مسلمان وہاں سے بھاگ آئے اور بہت سے ایمان کو چھپا کر وہیں رہ گئے۔ یمامہ دارالاسلام سے دارالحرب ہوگیا، یہاں تک کہ اذانیں بند ہوگئیں اور علی الاعلان کوئی شخص اللہ کا نام لینے والا نہ رہا۔

لیکن پردۂ غیب میں قدرت انقلاب کا یہ سامان کررہی تھی کہ ان ہی چھپے ہوئے مسلمانوں کے دلوں میں غیرت ایمانی متلاطم کردی گئی۔ اور ایک رات ان ہی چھپے ہوئے مسلمانوں نے اس مدعی نبوت کو قتل کرڈالا۔ اور صبح کو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو امیر منتخب کیا۔ اس کے بعد کافروں سے جنگ کی تو فتح ونصرت نے لبیک کہا اور دارالحرب پھر دارالاسلام ہوگیا اور دربار رسالت میں اس بشارت کو لے کر قاصد بھیجا گیا؛ مگر وہ ایسے وقت پہنچا کہ حضور رفیق اعلیٰ کو اختیار کرچکے تھے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول اللہ تھے ابن خلدون میں یہ پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ

Scanned with CamScanner

مذکور ہے جو اس امر پر صریح دلیل ہے کہ دار الحرب میں امیر کا منتخب کرنا کوئی نئی بدعت نہیں ہے؛ بلکہ عہد نبوی کا واقعہ ہے اور صحابہ کرامؓ کا اسوہ ہے اور آج ہندوستان میں خاص کر صوبہ بہار میں اس کی پیروی سے اسی سنت کا احیاء ہے، جو باعتبار نفس مقصد اور مناط حکم کے یکسانیت رکھتا ہے۔

یہاں یہ خلش کہ ان تصریحات میں سب کچھ سہی؛ لیکن اس کی تو حضور ﷺ کی سیرت میں کوئی نظیر نہیں ہے کہ آپ نے دار الحرب میں امت کے لئے امیر کا تقرر فرمایا ہو، اول تو یہ خلش اس لئے بے معنی ہے کہ یہ بالکل غلط ذہنیت ہے کہ ہر شرعی حکم پر امتثال اور عمل کرنے کے لئے حضور ﷺ کے عمل کی نظیر مانگی جائے۔ کیا پنجوقتہ اذان جو شعائر اسلام ہے، اس پر امتثال کے لئے حضور ﷺ کے عمل کی نظیر مانگی جائے گی؟ اور اس کے لئے نظیر پیش کی جا سکے گی۔

دوسرے یہ کہ ہر ذی علم کو؛ بلکہ ہر اس شخص کو جو حضور ﷺ کی سیرت سے معمولی لگاؤ اور آگہی رکھتا ہے، اس کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ کی سیرت میں اس کی نظیر موجود ہے اور سیرت کی کتابوں میں امرا کا ذکر ان کے ناموں کی تصریح کے ساتھ ملتا ہے۔ ذیل میں چند نظیریں ملاحظہ ہوں:

ذہن کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے یہ پیش نظر رکھا جائے، اس کے بعد ان نظیروں کو پڑھا جائے کہ حسب تصریح مبسوط دار الہجرۃ مدینہ منورہ میں غزوۂ بدر تک مسلمانوں کو شوکت حاصل نہیں تھی؛ یعنی فقہا کے اصطلاحی معنوں میں غزوۂ بدر تک مدینہ منورہ کی حیثیت دار الاسلام کی نہیں تھی؛ بلکہ مدینہ منورہ داخلی اور خارجی دونوں حیثیت سے غیر محفوظ تھا اور مسلمان اپنے کو مامون اور محفوظ نہیں سمجھتے تھے، داخلی نزاکت کا یہ حال تھا کہ حاکم کی روایت ہے:

جب رسول ﷺ اور آپ کے اصحاب مدینہ آئے اور انصار نے ان کو پناہ دی تو تمام عرب ایک ساتھ لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ صحابہ کرامؓ ہتھیار باندھ کر راتیں گذارتے تھے اور اسی حالت میں صبح کرتے تھے۔	لما قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم، واصحابه المدينة وآوتهم الانصار رمتهم العرب عن قوس واحدة وكانو لا يبيتون الا بالسلاح ولا يصبحون الا فيه.

نسائی شریف کی روایت ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ راتوں کو جاگ کر گذارا کرتے تھے۔

جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو رات جاگ کر گذارتے تھے۔	كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اول ما قدم مدينة يسهر بالليل.

خارجی حالت کیا تھی علامہ شبلیؒ نے لکھا ہے:

"قریش نے ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں، عبد اللہ بن ابی کو انہوں نے خط لکھ کر بھیجا کہ یا محمد (ﷺ) کو قتل کر دو، یا ہم آ کر ان کے ساتھ تمہارا بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ قریش کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مدینہ کی طرف گشت لگاتی رہتی تھیں کرز فہری مدینہ کی چراگاہوں تک آ کر غارت گری کرتا تھا" (سیرۃ النبی، ص: ۲۹۲، ج: ۱)۔

دار الحرب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند مقرر کردہ امراء

غزوۂ ابواء صفر ۲ھ | طبقات ابن سعد میں ہے کہ آغاز صفر میں ہجرت کے گیارہویں مہینہ رسول اللہ ﷺ کا غزوۂ ابواء ہے۔ علم حضرت حمزہ کے ہاتھ میں تھا اور مدینہ منورہ پر آپ نے سعد بن عبادہؓ کو امیر بنایا تھا۔ آپ پندرہ روز سفر میں رہے۔

غزوۂ بواط۔ ربیع الاول ۲ھ | طبقات ابن سعد میں ہے کہ ہجرت کے تیرہویں مہینہ مدینہ منورہ میں سعد بن معاذؓ کو امیر بنا کر دو سو مہاجرین کے ساتھ بواط روانہ ہوئے، ابن ہشام میں ہے کہ سائب بن مطعون کو امیر بنایا تھا۔

غزوۂ ذو العشیرہ، جمادی الثانی ۲ھ | یہ بالاتفاق جمادی الثانی ۲ھ کا واقعہ ہے، طبقات ابن سعد میں ہے کہ آپ نے مدینہ منورہ میں ابو سلمٰی بن عبد الاسد مخزومی کو امیر بنایا تھا، اس غزوہ میں آپ کے ساتھ ڈیڑھ سو یا دو سو مہاجرین تھے، یہ مقام مدینہ سے تقریباً ایک سو آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔

غزوۂ سفوان یا بدر اولیٰ بہ تعاقب کرز | کرز بن جابر فہری کے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کرنے کا واقعہ بروایت ابن سعد ربیع الاول ۲ھ کا ہے اور بروایت ابن ہشام غزوۂ

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

ذوالعشیر کے دس دن بعد یعنی جمادی الاخریٰ ۲ھ کا ہے۔ اس نے مدینہ کی چراگاہ کو لوٹا اور مویشی کو ہنکا کر لے گیا؛ جس میں حضور ﷺ کے اونٹ بھی تھے، اس کے تعاقب میں حضور ﷺ وادی سفوان تک پہنچے، جو نواح بدر میں ہے۔ مدینہ منورہ میں آپ نے زید بن حارثؓ کو امیر بنایا تھا۔

غزوہ بدر کبریٰ ۲ھ

طبقات ابن سعد میں ہے، کہ ۱۲ر رمضان یوم دوشنبہ ۲ھ میں روانہ ہوئے۔

ابولبابہ بن المنذر انصاری کو مدینہ منورہ کا والی بنایا، اور عاصمؓ کو اہل عالیہ پر والی بنایا۔

یہ پانچوں واقعے صرف ایک سنہ یعنی ۲ھ کے ہیں، جب کہ مدینہ منورہ کی حیثیت دارالاسلام کی نہیں تھی، ان نظائر کی موجودگی میں یہ کون کہہ سکتا ہے کہ حضور ﷺ کی سیرت میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے دارالحرب میں امت کے لئے امیر مقرر فرمایا ہو اور وہ لوگ جو صلح حدیبیہ تک مدینہ کو دارالاسلام نہیں کہتے ہیں، ان امراء کی فہرست کتنی طویل ہو جائے گی۔

مسئلہ امارت

تصریحات فقہائے کرام کی روشنی میں

قرآن وحدیث کے بعد میں فقہائے کرام کی بھی چند تصریحات دارالحرب میں مسئلہ امارت اور تقرر امیر کے متعلق اس نقطہ نظر سے پیش کر دینا چاہتا ہوں کہ بحث کا یہ پہلو بھی سامنے آ جائے کہ علمائے امت اور سلف صالحین کی رائیں آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کے متعلق کیا تھیں۔

(۱) قال فی مجمع انقاویٰ: غلب علی المسلمین ولاۃ الکفار و یجوز للمسلمین اقامۃ الجمعۃ والاعیاد ویصیر[۱] القاضی قاضیا بتراضی المسلمین ویجب علیھم ان یلتمسوا والیًا مسلمًا۔
(طحطاوی، ص: ۳۲۹، ج: ۱)

مجمع الفتاویٰ میں صاحب مجمع الفتاوٰی نے لکھا ہے کہ (ایسی صورت میں کہ) مسلمانوں پر کفار کے حکام غالب ہو گئے ہوں (یعنی حکومت کافرہ قائم ہو گئی ہو تو) مسلمانوں کو ایسے مقام میں جمعہ وعیدین پڑھنا جائز ہے (اور اس وقت) مسلمانوں کی رضامندی سے قاضی، قاضی ہوگا۔ اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے لئے والی مسلم کی جستجو کریں۔

۱۔ مسلمانوں کی رضامندی سے مراد مسلمانوں کے ارباب حل وعقد ہیں۔ اور یہ مسئلہ اتفاقی ہے کہ اگر کسی ایسے مقام پر جہاں اسلامی بادشاہ یا والی وامیر نہ ہو۔ ارباب حل وعقد کسی شخص کو قاضی مقرر کریں، جو مسلمانوں کے تنازعات کا فیصلہ کرے تو وہ درست ہے؛ لیکن اس دور کے بعض صاحب کو "بزازیہ" کی ایک عبارت سے (جس کو ہم آگے چل کر نقل کریں گے) یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ "ولایت قضا" قوم کی تفویض کرنے سے کوئی شخص قاضی نہیں ہو سکتا ہے، اور اس بنا پر فقہائے کرام کی وہ تمام تصریحات جو "**یصیر القاضی قاضیاً بتراضی المسلمین**"

Scanned with CamScanner

(۲) وامافی بلادعلیھا ولاۃ الکفار فیجوز للمسلمین اقامۃ الجمع والاعیاد۔ ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین ویجب علیھم طلب وال مسلم۔
(البحرالرائق ص:۲۹۸، ج:۶)

اور بہر حال وہ تمام شہر جہاں کفار والی ہوں (یعنی حکومت کافرہ ہو) تو وہاں جمعہ اور عیدین کا قائم کرنا جائز ہے اور مسلمانوں کی رضامندی سے قاضی، قاضی ہوگا۔ پس مسلمانوں پر واجب ہے کہ (اپنے میں سے) مسلمان والی طلب کریں۔

کے الفاظ میں ہیں، اس سے مراد "قاضی الجمعہ" ہے۔

لیکن یہ مراد لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اول اس وجہ سے کہ "قاضی الجمعہ" کوئی فقہی اصطلاح نہیں ہے، جمعہ کے لئے جس نظم کی ضرورت ہے، وہ امام وخطیب کی ہے۔ اور فقہ میں خطیب اور امام ہی کی اصطلاح جمعہ کے لئے مستعمل ہے اور مشہور ومعروف ہے دوم یہ کہ قاضی کو جمعہ کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت اور اہمیت بھی نہیں ہے کہ جمعہ کی نماز قاضی ہی کو پڑھانا چاہئے؛ تاکہ یہ لازم آئے کہ اس کے لئے ضرورۃً قاضی جمعہ بنالیا جائے۔ بلکہ فقہائے کرام کی یہ صراحت ہے کہ خلیفۃ المسلمین یا والی کا مقرر کردہ قاضی بلد اس وقت جمعہ کی امامت اور خطابت کا فرض ادا کرسکتا ہے؛ جب کہ اس کے منشور میں اس کے اذن کی صراحت ہو فتاوٰی بزازیہ میں ہے:

ولیس للقاضی ان یصلی بالناس الجمعۃ الااذاکان فی منشورہ ذلک وقول محمدرحمہ اللہ القاضی لہ ان یجمع حملہ المشایخ علٰی ھٰذا۔
(کتاب ادب القاضی)

قاضی کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو جمعہ کی نماز پڑھائے بجز اس صورت کے کہ قاضی کو منشور میں جمعہ کی نماز پڑھانے کا اختیار دیا گیا ہو اور امام محمدؒ کے اس قول کو کہ قاضی جمعہ پڑھا سکتا ہے، مشائخ نے اسی پر محمول کیا ہے (یعنی یہ کہ قاضی کو منشور میں پڑھانے کا اختیار دیا گیا ہو)۔

(۳) امافی بلادعلیھا ولاۃ الکفار فیجوز للمسلمین اقامۃ الجمع والاعیاد ویصیرالقاضی قاضیا بتراضی المسلمین فیجب علیھم ان یلتمسوا والیًا مسلمًا منھم۔
(ردالمحتار ص:۳۳۹، ج:۳)

اور بہر حال وہ تمام شہر جہاں کفار والی ہوں (یعنی حکومت کافرہ ہو) تو وہاں جمعہ اور عیدین کا قائم کرنا جائز ہے۔ اور مسلمانوں کی رضامندی سے قاضی ہوگا۔ پس مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے میں سے والی مسلم طلب کریں۔ (یا کافروں سے والی مسلم طلب کریں)

اور البحرالرائق میں ہے:

واما اقامۃ الجمع والاعیاد فیملکھا القاضی ان کان فی منشورہ والافلا۔ وقول محمدرحمہ اللہ للقاضی ان یجمع حملہ المشائخ علی ھذا۔
(جلد:۶)

جمعہ اور عیدین کی اقامت کا قاضی ایسی صورت میں مالک ہوگا کہ اس کے منشور میں اس کا اختیار ہو اور اگر منشور میں اختیار نہ ہوگا تو جمعہ اور عیدین کی اقامت کا اس کو اختیار نہ ہوگا امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کو کہ قاضی جمعہ پڑھا سکتا ہے مشائخ نے اسی پر محمول کیا ہے۔

پھر فقہائے کرام کی یہ تصریح بھی موجود ہے کہ جب ایسا شخص موجود نہ ہو، جس کو اقامت جمعہ کا حق حاصل ہے تو عام لوگوں کو چاہئے کہ ضرورۃً خطیب مقرر کرلیں نہ کہ قاضی، ردالمحتار کے باب جمعہ میں ہے:

لومات الوالی ولم یحضر لفتنۃ ولم یوجد احد احل ممن لہ حق اقامۃ الجمعۃ نصب العامۃ لھم خطیبا للضرورۃ کما سیاتی مع انہ

اگر والی مرگیا ہو یا فتنہ کے باعث وہ نہ آسکا ہو اور ان لوگوں میں سے جن کو اقامت جمعہ کا حق ہے کوئی شخص موجود نہ ہو تو عامہ مسلمین اپنے لئے خطیب مقرر کرینگے، جیسا کہ یہ مسئلہ آگے

Scanned with CamScanner

(۴) وفی معراج الدرایة عن المبسوط البلادالتی فی ایدی الکفار بلادالاسلام۔

اورمعراج الدرایہ میں مبسوط سے منقول ہے کہ جتنے شہر کفاروں کے قبضہ میں ہیں (جو پہلے مسلمانوں کے قبضہ میں تھے)

لا امیر ولاقاضی ثمة اصلا۔ وبهذا ظهر جهل من یقول لاتصح الجمعة فی ایام الفتنة مع انها تصح فی البلادالتی یستولی علیها الکفار۔

آئیگا۔ علامۃ المسلمین اپنے لئے خطیب کا باوجود اسکے بھی تقرر کر سکیں گے کہ اس مقام پر نہ کوئی امیر ہو نہ قاضی ہو اور اس سے اس شخص کی جہالت واضح ہوگئی جو کہتا ہے کہ فتنہ کے زمانہ میں جمعہ صحیح نہیں ہے؛ باوجود اسکے کہ جمعہ ان شہروں میں صحیح ہے جس پر کفار کی حکومت ہے۔

اور اگر خلیفہ یا والی یا سلطان اسلام موجود ہوں تو ان کی موجودگی میں عام مسلمانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی کو جمعہ کا امام اور خطیب مقرر کرلیں، درمختار کے باب جمعہ میں ہے:۔

نصب العامة الخطیب غیر معتبر مع وجود من ذکر امامع عدمهم فیجوز للضرورة۔

عام لوگوں کا، ان لوگوں کی موجودگی میں جن کا ذکر اوپر ہوا خطیب کا مقرر کرنا معتبر نہیں ہے لیکن ان لوگوں کی عدم موجودگی کے موقع میں تو پھر بحالت ضرورت جائز ہے۔

سوم۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اگر ''قاضی الجمعہ'' کی مراد یہ بتائی جائے اور کہا جائے کہ فقہائے کرام کا مطلب یہ ہے کہ جن بلاد مسلمین پر کفار کا تسلط ہو تو وہاں مسلمانوں کے لئے اقامت جمعہ اس شرط پر جائز ہے کہ وہاں ایک قاضی بھی ہو اور وہ قاضی ''بتراضی المسلمین'' ہوگا، یعنی جمعہ کی فرضیت کے لئے مصر کی شرط اور مصر کے لئے حاکم وقاضی کا وجود جن کے نزدیک ضروری ہے، ان کے مسلک کی بنا پر جمعہ کے انعقاد کے لئے قاضی بھی ہونا چاہئے اور اسی نسبت سے قاضی ''قاضی جمعہ'' ہے مگر صدر کی اس تصریح کے بعد کے قاضی جمعہ نہ تو کوئی فقہی اصطلاح

ہے، نہ جمعہ کے لئے اقامت جمعہ کی حیثیت سے اسکی کوئی اہمیت ہے، تو پھر اس قاضی کا کیا مصرف ہے، اگر امور متنازعہ فیہ کا فیصلہ کرنا ہے جو قاضی شرعی کا منصب ہے تو پھر وہ حقیقی اور اصلی قاضی ہوا، جو مقدمات ومخاصمات کا فیصلہ کرے گا تو اس صورت میں لازم یہ آئے گا کہ اس ملک میں جس قاضی کے قیام کے جواز کا انکار کیا جا رہا ہے اسی کا ثبوت ہو رہا ہے۔ بہرحال یہ تاویل کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

بظاہر ان کی غلط فہمی کی بنیاد یہ معلوم ہوتی ہے کہ فقہ کی ایسی عبارت سے جس کا مفاد یہ ہے کہ اگر کسی اہل بلد نے مجتمع ہو کر کسی شخص کو منصب قضا پر مقرر کیا تو یہ تقلید قضا صحیح نہیں ہے، تو انہوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا کہ حقیقی منصب قضا پر کسی کو مقرر کرنے کا حق عامۃ المسلمین کو نہیں ہے؛ بلکہ صرف سلطان اور ولی کو ہے مثلاً جامع الفصولین میں ہے۔

اهل البلدة لوتبایعوا علی سلطنة احد یصیر سلطانا بخلاف القاضی لضرورة فی الاول لافی الثانی۔
(من الفصل الاول فی القضاء)

اہل شہر اگر کسی شخص کی سلطنت پر بیعت کرلیں گے تو وہ سلطان ہو جائیگا، بخلاف قاضی کے؛ کیونکہ پہلی صورت میں ضرورت داعی ہے اور دوسری صورت میں ضرورت داعی نہیں ہے۔

بزازیہ میں ہے:

اجتمع اهل البلدة وقدموا رجلاً علی القضا لایصح لعدم الضرورة وان مات سلطانهم واجتمعوا علی سلطنة رجل جاز للضرورة۔
(کتاب ادب القاضی)

اہل شہر نے مجتمع ہو کر قضا کے لئے کسی مرد کو آگے بڑھایا تو یہ صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ ضرورت داعی نہیں ہے، اور اگر بادشاہ مرجائے اور کسی مرد کی سلطنت پر سب لوگ مجتمع ہو جائیں تو جائز ہے کیونکہ ضرورت داعی ہے۔

حالانکہ ان ہی عبارتوں میں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی موجود ہے اور وہ ضرورت اور عدم ضرورت کی صراحت ہے چنانچہ ''ردالمحتار'' کے کتاب القضا میں بزازیہ سے اس مسئلہ کو نقل کر کے

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

اس غلط فہمی کا اسی بنیاد پر جواب بھی دے دیا گیا ہے؛ جس کی طرف شاید ان کی توجہ نہیں ہوئی۔

ردالمحتار کے الفاظ یہ ہیں:

قلت وهذا حيث لاضرورة والا فلهم تولية القاضى ايضًا كما ياتى بعده۔

(کتاب القضاء، جلد: ۴)

میں کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ (یعنی عامۃ المسلمین کا قاضی بنانا صحیح نہیں ہے) یہ اس موقع کے لئے ہے جہاں ضرورت نہیں ہے ورنہ عامۃ المسلمین کو تولیت قضا کا بھی اختیار ہے جیسا کہ مسئلہ اس کے بعد آئے گا۔

حاصل یہ کہ بزازیہ وغیرہ کی اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں کہ اقامت قاضی کی ضرورت نہ ہو، عامۃ المسلمین کی اقامت قاضی صحیح نہیں ہے؛ لیکن اگر ضرورت ہو تو پھر مسئلہ یہ ہے کہ "**فهم تولية القضاء**"، یعنی عامۃ المسلمین کو جس طرح اقامت سلطان کا حق ہے، اقامت قاضی کا بھی حق ہے۔

دوسری بنیاد غلط فہمی کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے صرف باب جمعہ میں **يصير القاضى قاضيًا بتراضى المسلمين** کو دیکھا اس لئے شاید انہوں نے یہ سمجھا کہ جمعہ کے لئے کوئی قاضی ہوگا اور اس عبارت کو قاضی جمعہ پر محمول کیا؛ مگر اس قسم کی عبارتیں کتب فقہ کے ابواب قضا میں بھی مذکور ہیں اور اصلی مقام ان عبارتوں کے ذکر کا یہی ہے۔ باب جمعہ میں تو ضمنی طور پر اس مسئلہ کا ذکر آ جاتا ہے۔

لابدار الحرب لانهم لم يظهروا فيها حكم الكفر بل القضاة والولاة مسلمون يطيعون عن ضرورة اوبدو نها وكل مصرفيه وال من جهتهم يجوزله اقامة الجمع والاعياد والحد وتقليد القضاة لاستيلاء المسلم عليهم فلوا لولاة كفارا يجوز للمسلمين اقامة الجمع والاعياد ويصير[1] القاضى قاضيا بتراضى المسلمين ويجب عليهم ان يلتمسوا واليا مسلما۔

(ردالمحتار، ص: ۵۹۳، ج: ۱)

وہ سب بلاد اسلام ہیں، دارالحرب نہیں ہیں، اس لئے کہ کافروں نے ان شہروں میں کفر کا حکم ظاہر نہیں کیا ہے (یعنی ملک میں حکومت کافرہ کے قوانین نافذ نہیں ہیں) بلکہ قضاۃ و ولاۃ سب مسلمان ہی ہیں۔ جو کفار (بادشاہوں) کی اطاعت کرتے ہیں، بضرورت یا بغیر ضرورت اور ہر وہ شہر جس میں (مسلمان) والی کافروں کی طرف سے مقرر ہو تو اس والی مسلم کیلئے جمعہ اور عید کا قائم کرنا اور حد کا قائم کرنا اور قاضی مقرر کرنا سب جائز ہے؛ کیونکہ (حقیقۃً) مسلمان ہی مسلمانوں پر حاکم ہے، پس اگر شہر کے ولاۃ (حکام) کفار ہوں تو مسلمانوں کے لئے ایسے مقام میں جمعہ پڑھنا جائز ہوگا اور (اس صورت میں) مسلمانوں کا قاضی مسلمانوں کی رضا مندی سے ہوگا (یعنی جس کو مسلمان مشورہ کر کے قاضی بنا دیں گے وہی قاضی ہوگا) اور (ایسی مجبوری کی حالت میں) مسلمانوں پر واجب ہے کہ مسلمان والی کی جستجو کریں۔

---

[1] تراضی مسلمین یعنی مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کی رضامندی سے، قاضی کے تقرر کی بنا اس امر پر ہے کہ دراصل ولایت عامہ ہو یا ولایت خاصہ سب کے لئے منبع اور مصدر یہی ہوتے ہیں، اسی وجہ سے جس طرح مسلمانوں کی تراضی اور رضامندی یعنی مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کے انتخاب سے وقت ضرورت قاضی شرعاً مقرر ہو سکتا ہے؛ تاکہ مسلمانوں کے باہمی مقدمات کا فیصلہ

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

ان سب قولوں کا حاصل اور مشترک مفاد یہ ہے کہ جن شہروں میں کفار کا قبضہ ہو وہاں کے مسلمانوں پر ایک والی کا قیام شرعاً واجب ہے۔ اور اگر وہاں کے مسلمان باہمی رضامندی سے ایک شخص کو قاضی بنالیں گے تو وہ شرعاً ان کا قاضی ہوگا۔ ہاں آخر کے قول میں کفار کے قبضہ کی بھی تفصیل کردی گئی ہے۔ اور اس کی تین صورتیں بتائی گئی ہیں:

(الف) ایک یہ کہ قبضہ اور ملک اور تصرف سب مسلمانوں کا ہو؛ لیکن کافر بادشاہ سے بھی تعلق ہے جیسا کہ ان دنوں عراق، عرب کا حال ہے۔

کرے اور ان تمام کاموں کو حتی الامکان انجام دے جو قاضی اسلام کا فرض ہے۔ اسی طرح وقت ضرورت مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کے انتخاب سے کسی صوبہ کا والی بھی منتخب ہوسکتا ہے؛ تاکہ وہ تمام ان کاموں کو حسب استطاعت انجام دے، جو ایک والی مسلم کا فریضہ ہے؛ کیونکہ ولایت عامہ ہو یا ولایت خاصہ ان سب کے قیام کا مناط ایک ہے یعنی اجتماعی احکام اسلام کا تحفظ واجراء اور ان سب کے قیام کا حقیقۃً منبع ومصدر بھی ایک ہی ہے یعنی عامۃ المسلمین۔

پس قاضی اور والی بلکہ خلیفۃ المسلمین کو اپنے اپنے حدود میں جو حقوق ولایت شرعیہ بحکم اللہ ورسول حاصل ہوتے ہیں وہ سب نیابۃً عن المسلمین ہوتے ہیں، یہاں تک کہ اگر خلیفۃ المسلمین یا والی کسی شخص کو قاضی مقرر کرتا ہے اور وہ صحیح ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خلیفہ اور والی منتخب ہونے کے بعد عامۃ المسلمین کا نائب ہوتا ہے اور اسی نیابت کی وجہ سے مسلمانوں کی طرف سے شرعاً اس کو یہ حق حاصل ہوتا ہے؛ کہ وہ قاضی مقرر کرے اور مقرر کرنے کے بعد وہ قاضی حقیقۃً مسلمانوں ہی کا نائب ہوتا ہے؛ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ اور والی کے انتقال سے اس کا مقرر کردہ قاضی منصب قضا پر بدستور قائم رہتا ہے؛ کیونکہ حقیقۃً اس کو یہ منصب عامۃ المسلمین کی طرف سے ملا ہے اور وہ موجود ہے؛ اس لئے جہاں سے اس کو یہ منصب حاصل ہوا ہے، جب وہ موجود ہے تو والی اور خلیفہ کے مرنے سے یہ منصب فوت نہیں ہوسکتا ہے۔

پس جب ولایت عامہ اور خاصہ کا مناط حکم ومنبع ومصدر ایک ہے تو جس طرح سے ضرورتاً مسلمانوں کی طرف سے قاضی کا انتخاب صحیح اور واجب ہوتا ہے، اسی طرح سے ضرورۃً نظم

(ب) دوسرے یہ کہ قبضہ اور اقتدار کلی کافر بادشاہ کا ہے اور اس کو حاکم اور والی کے عزل ونصب کا اختیار ہے۔ مگر اندرون ملک داخلی امور کا نظم ونسق مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ گویا داخلی طور پر حکومت مسلمان کی ہے؛ جس طرح تقریباً ہندوستان کی بااختیار اسلامی ریاستیں ہیں۔

(ج) تیسرے یہ کہ کفار بالکلیہ ہر طرح مسلط ہیں، اور مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان کے کوئی اختیار تصرف کا نہیں ہے، جیسے صوبہ بہار وغیرہ جو ہندوستان کا برطانوی علاقہ ہے۔

ملت کے لئے انتخاب والی بھی صحیح ہے، اور واجب ہوگا اور اسی علت حکم میں اشتراک کی وجہ سے مسئلہ قیام امارت کے ثبوت کے لئے فقہاء کی ان عبارتوں سے بھی استدلال کیا جانا صحیح ہے جس میں ''یصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین'' کی صراحت کی گئی ہے۔

متذکرہ صدر اصول کے سمجھنے کے لئے ملک العلماء صاحب البدائع کی حسب ذیل عبارت برہان محکم ہے:

القاضی لایعمل بولایة الخلیفة وفی حقه بل بولایة المسلمین وفی حقوقهم وانما الخلیفة بمنزلة الرسول عنهم لهذا لم تلحقه العهدة کالرسول فی سائر العقود۔ والوکیل فی النکاح واذا کان رسولاً کان فعله بمنزلة فعل عامة المسلمین وولایتهم بعد موت الخلیفة

قاضی خلیفہ کے حق کے اعتبار سے یا خلیفہ کی ولایت کی وجہ سے عمل نہیں کرتا ہے؛ بلکہ قاضی مسلمانوں کے حق کے اعتبار سے اور مسلمانوں کی ولایت کے اعتبار سے عمل کرتا ہے، خلیفہ کی حیثیت عام مسلمانوں کے پیغامبر اور قاصد کی ہے اسی وجہ سے قاضی کے قضاء کی ذمہ داری خلیفہ کو لاحق نہیں ہوگی، جس طرح تمام معاملات میں ذمہ داری پیغامبر پر نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ ان طرفین پر ہوتی ہے جو معاملہ کرتے ہیں) اور جس طرح نکاح میں وکیل پر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے (بلکہ عاقدین پر کیونکہ وکیل سفیر محض ہوتا ہے) اور جب خلیفہ کی حیثیت پیغامبر کی ہوئی تو قاضی کا فعل بمنزلہ فعل عامۃ المسلمین کے ہوگا، اور عامۃ المسلمین کی ولایت

Scanned with CamScanner

پہلی دونوں صورتوں میں مبسوط کی روایت کی بنا پر مسلمانوں کو والی اور قاضی مقرر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ پہلی صورت میں تو حقیقۃً مسلمانوں پر مسلمان ہی کی حکومت ہے لہٰذا احکام شرعیہ کے انفصال کی وہ ولایت رکھتا ہے۔ دوسری صورت میں اس لئے ضرورت نہیں ہے کہ گو ملک قبضہ میں حقیقۃً مسلمان کے نہیں ہے۔ مگر داخلی امور چونکہ بتمامہ مسلمان ہی کے ہاتھ میں ہے اور احکام شرعیہ کے انفصال کا بھی تعلق ان ہی کی ذات سے ہے، اور کفار حاکم سے کوئی تعلق نہیں ہے تو ایسی صورت میں احکام شرعیہ کا تعلق مسلمان ہی حاکم سے سمجھا جائے گا۔

باقية فيبقى القاضى على ولا يته وهذا بخلاف العزل۔ فأن الخليفة اذاعزل القاضى اوالوالى يعزل بعزله۔ ولاينعزل بموته لانه لاينعزل بعزل الخليفه۔ ايضًا۔ حقيقة بل بعزل العامة لماذكرنا ان توليته بتولية العامة والعامة ولوه الاستبدال دلالة لتعلق مصلحتهم بذلك فكانت ولايته منهم معنافى العزل فهوا لفرق بين العزل والموت۔

(بدائع، ص:۱۶، ج:۷، من فصل واما بيان ما يخرج به القاضى عن القضاء)

چونکہ خلیفہ کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ لہٰذا قاضی اپنی ولایت پر باقی رہے گا۔ بخلاف عزل کے، اسلئے کہ خلیفہ قاضی کو یا والی کو معزول کر دے گا تو قاضی اور والی اس کے عزل سے مغرول ہو جائے گا۔ اور خلیفہ کے مرنے سے معزول نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ قاضی حقیقۃً خلیفہ کے عزل کرنے سے معزول نہیں ہوتا ہے بلکہ عامہ مسلمین کے عزل سے معزول ہوتا ہے، وجہ اس کی وہی ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں کہ خلیفہ کی تولیت عامہ مسلمین کی تولیت ہے۔ اور عامہ مسلمین نے خلیفہ کو ایک قاضی کی جگہ پر دوسرے قاضی کے بدل دینے کی ولایت دی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کے مصالح کا تعلق ہے۔ پس عزل کرنے میں عامہ مسلمین ہی کی جانب سے خلیفہ کو ولایت حاصل ہے۔ بہر حال عزل اور موت میں یہ فرق ہے۔

لیکن اس کے ساتھ جو احکام شرعیہ کا تعلق ہوگا اس کے متعلق ان کا فیصلہ شرعی سمجھا جائے گا۔ اس کی جہت یہ نہیں ہوگی کہ وہ کافر بادشاہ کی طرف سے والی اور حاکم بنائے ہوئے ہیں۔ اور صاحب اختیار واقتدار ہیں، کیونکہ محض اس جہت کے حاکم تو اس تیسری صورت میں بھی ہیں جن کو اقتدار واختیار کافر بادشاہ کی جانب سے حاصل ہے؛ بلکہ ان کو احکام شرعیہ کے انفصال و نفاذ کا اختیار اس جہت سے ہوگا کہ وہ مسلمان ہیں اور حقیقتاً مسلمان ہی مسلمان کا حاکم ہے۔ جس کی طرف صاحب مبسوط نے "**لاستيلاء المسلم عليهم**" سے اشارہ کیا ہے۔

یہاں جس جہت کو صاحب مبسوط نے اشارۃً بیان کیا ہے؛ صاحب بحر الرائق نے اس کو نہایت صاف لفظوں میں بالتصریح بیان کر دیا ہے کہ کافر بادشاہ کی طرف سے جو مسلمان والی اور حاکم ہوتا ہے اور اس کو قاضی وغیرہ مقرر کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ اس میں یہی معنی ملحوظ ہیں کہ مسلمان مسلمانوں پر حاکم ہیں اور کافر بادشاہ کی اطاعت کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ **بل هى موادعة ومخادعة**؛ البحر الرائق کے الفاظ یہ ہیں:

وكل مصر فيه وال مسلم من جهة الكفار يجوزفيه اقامة الجمع والاعياد واخذ الخراج وتقليد القضاء وتزويج الايامى لاستيلاء المسلم عليهم واما طاعة الكفرة فهى موادعة ومخادعة۔

(البحر الرائق، ص:۲۹۸، ج:۶)

ہر ایسا شہر جس میں کفار کی جانب سے مسلمان والی ہو وہاں جمعہ اور عیدین کی اقامت، خراج کی وصولی، قاضی کی تقرری، ایامی کا نکاح جائز ہے؛ کیونکہ مسلمان کا مسلمانوں پر استیلاء ہے اور کافر کی اطاعت کی حیثیت، موادعت اور مخادعت ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ کافر کو اصولاً بفحوائے "**لاولاية الكافر على مسلم**" احکام شرعیہ میں کسی طرح کی ولایت کا حق نہیں ہے، اور اس کا مقرر کیا ہوا والی یا قاضی شرعاً صحیح معنوں میں نہ والی ہے نہ قاضی جب تک مسلمان خود اس پر مجتمع نہ ہو جائیں۔

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

تیسری صورت میں چونکہ بادشاہ اوراس کے والی سب کے سب کافر ہیں اوراحکام شرعیہ کے انفصال کی ولایت شرعاً کافر والی یا قاضی کو حاصل نہیں ہے؛ چاہے وہ حکومت کافرہ کی جانب سے لاکھ اختیار واقتدار رکھتے ہوں؛ اس لئے ایسی صورت میں مسلمانوں پر ایک والی کا مقرر کرنا شرعاً واجب ہے، تاکہ اس کی ماتحتی میں احکام شرعیہ انجام دیئے جائیں۔ ہاں اگر وہ مسلمان حکام (جن کو حکومت کافرہ کی طرف سے مسلمانوں کا والی یا قاضی مقرر کیا گیا ہو) اس قدر آزاد ہوں کہ اسلامی احکام وقوانین کے مطابق احکام جاری کرسکتے ہوں، اور مسلمان بھی ایسے حکام کو جائز احکام تسلیم کرتے ہوں تو وہ شرعاً حاکم مسلمانوں کے ہوں گے، اور ان کا فیصلہ شرعاً جائز ہوگا۔

حاصل یہ کہ دارالحرب میں جمعہ وعیدین کی نماز پڑھ سکتے ہیں اور تراضی بالمسلمین سے قاضی بھی مقرر کرسکتے ہیں، مگر محض اتنے کام سے شرعی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہوسکتے ہیں جب تک کہ اجتماعی زندگی کے لئے ایک مسلمان والی، ایک مسلمان امیر نہ مقرر کرلیں اور جب والی کا تقرر ہوجائے گا تو اب ساری ذمہ داری مثلاً قاضی وغیرہ کا مقرر کرنا اسی والی کے ذمہ میں آجائے گی۔

پس قوم کے ذمہ جو چیز واجب اور لازم ہے، وہ دراصل والی مقرر کرنا ہے اور اصولی طور پر سب سے پہلا کام اس کا یہی ہے جیسا کہ علامہ ابن ہمامؒ نے اسکی تصریح کردی ہے:

واذالم يكن سلطان ولامن يجوز التقلدمنه كما هوفي بعض بلاد المسلمين غلب عليهم الكفار كقرطبة في بلادالمغرب الآن وبلنسيه وبلادالحبشة واقروا المسلمين عندهم على مال يوخذ منهم- يجب عليهم ان يتفقوا

اور جب کہ (مسلم) بادشاہ نہ ہو، اور نہ ایسا شخص ہو جس کا قاضی مقرر کرنا جائز ہو (مثلاً والی منجانب سلطان وغیرہ) جیسا کہ یہی حالت مسلمانوں کے ان بعض بلاد کی ہے جس پر کفار غالب آگئے ہیں (یعنی حکومت کافرہ قائم ہو گئی ہے) جیسے بلاد مغرب میں ان دنوں قرطبہ ہے اور بلنسیہ اور بلاد حبشہ ہے اور (بعد غلبہ کفار) کافروں نے مسلمانوں سے کچھ

على واحد منهم يجعلونه واليا فيولى قاضيا اويكون هوالذى يقضى بينهم وكذا ينصبوا لهم اماما يصلى بهم الجمعة- الخ-
(فتح القدیر، ص:۳۶۵، ج:۶)

مال (خراج) لے کر (ان شہروں میں) اپنی حکومت کے اندر قیام کی اجازت دیدی ہے، تو ایسی حالت میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنی جماعت میں سے کسی ایک شخص کو متفق ہوکر والی بنائیں، پس وہی والی قاضی مقرر کرے گا یا والی خود ہی مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ کرے گا۔ اور جس طرح مسلمانوں کو اپنا والی مقرر کرنا چاہئے۔ اسی طرح اپنا امام جمعہ بھی مقرر کرنا چاہئے (اگر والی مقرر نہ ہوا ہو یا مقرر ہو چکا ہو؛ لیکن کسی وجہ سے اس کو امام جمعہ مقرر کرنے کا موقع نہ ملا ہو)

بہرحال ایسے دارالحرب کے اندر جہاں بادشاہ اوراس کے والی سب کافر ہوں، سب سے پہلا کام اصولاً مسلمانوں کا نصب والی ہے اور یہ شرعاً ان پر واجب ہے۔ اور اسی طرح اگر والی کی طرف سے امام کسی وجہ سے متعین نہ ہوا ہو، یا یہ کہ والی ہی نہ ہو تو دارالحرب کے اندر امام جمعہ کا انتخاب کر لینا بھی واجب ہے۔ مبسوط میں ہے:

فقد ذكر ابن رستم عن محمد رحمهما الله تعالىٰ انه لومات عامل افريقة فاجتمع الناس على رجل فصلے بهم الجمعة أجزاهم- (مبسوط، ص:۲۵، ج:۲)

ابن رستم نے امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ اگر افریقہ کا عامل (حاکم) مرگیا پس مسلمانوں نے ایک شخص پر اتفاق کرلیا، اس شخص نے نماز جمعہ پڑھائی تو نماز ان کی درست ہوگی۔

بہرحال ان تصریحات کی بناپر جن کو فقہاء کرام نے قرآن وحدیث کے ارشادات کے ماتحت لکھا ہے، مسلمانوں پر اپنی جماعتی زندگی کے لئے دارالحرب میں ایک والی کا نصب کرنا واجب ہے۔

Scanned with CamScanner

مسئلہ امارت

علمائے امت کے فتاویٰ کی روشنی میں

قرآن وحدیث اور فقہاء حنفیہ کی تصریحات کے بعد اس مسئلہ کے متعلق علمائے امت کے فتاویٰ کے ذکر کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ مگر دو لحاظ سے ہم چند فتاوی کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک یہ کہ فقہائے حنفیہ کے علاوہ بعض ایسے علماء کی رائے بھی پیش کروں جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد نہیں ہیں؛ بلکہ دوسرے ائمہ کے مقلد ہیں یا جو کسی امام کے مقلد نہیں ہیں؛ بلکہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اپنا آزاد مسلک رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بعض ذمہ دار علمائے ہند کے فتاویٰ اس مسئلہ پر اس نقطۂ نظر سے پیش کروں کہ عوام کو تسکین خاطر ہو جائے کہ علمائے ہند اس سے غافل نہ تھے، اگرچہ زمانہ کی نامساعدت کے باعث وہ امارت شرعیہ کی بنیاد اپنے وقت میں ہندوستان میں نہ رکھ سکے۔

علامہ ابن تیمیہؒ کا فتویٰ

قد اوجب النبی صلی اللہ علیه وسلم تامیر الواحد فی الاجتماع القلیل العارض فی السفر فهو تنبیه علی انواع الاجتماع والواجب اتخاذ ولایة القضاء دینا وقربة فانها من افضل القربات وانما فسد حال الاکثر

رسول اللہ ﷺ نے قلیل اجتماع کی حالت میں جو سفر میں عارضی ہوتا ہے۔ شخص واحد کو امیر بنانا واجب قرار دیا ہے۔ پس اس حکم میں تمام انواع اجتماع پر تنبیہ ہے (یعنی مسلمانوں کی آبادی و اجتماع امیر بنانے سے خالی نہیں ہونی چاہئے اور ولایۃ قضا کا بنانا بلحاظ دین اور تقرب الی اللہ کے واجب ہے اسلئے کہ ولایۃ قضا افضل تقربات سے ہے

لطلب الریاسة والمال بها، ومن فعل مایمکنه لم یلزمه مایعجز عنه۔

(کتاب الاختیارات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ)

اور محض طلب ریاست اور طلب مال کی وجہ سے بہت سے لوگوں کا حال برا ہوا اور جس قدر استطاعت اور امکان میں ہے اس قدر کرنے کے بعد اس پر یہ لازم نہیں ہے کہ جس سے وہ عاجز ہے اس کو بھی کرے (مثلاً ہندوستان یا صوبہ بہار کا مسلم والی حکومت کافرہ کی وجہ سے حدود و قصاص جاری نہ کر سکے یا اپنی ہر اطاعت پر لوگوں کو مجبور نہ کر سکے تو کوئی حرج نہیں ہے؛ کیونکہ اس مجبوری کی حالت میں یہ امور اس پر لازم بھی نہیں ہیں۔ (مؤلف)

امام سید سمہودیؒ کا فتویٰ

وبالجملة فالتمادی علی ترک اقامة قاض فی قطر من الاقطار معصیة (الی ان قال) یوئده قول المقدسی فی القضاء من الاشارات اذا اجتمع اهل بلدان لا یلی احد فیهم القضاء اثموا۔ الخ۔

ایک زمانہ تک ملک کے کسی نواح میں اقامت قاضی کا چھوڑ دینا معصیت ہے، اس کی تائید علامہ مقدسی کے اس قول سے ہوتی ہے جو "اشارات" کے باب القضا میں ہے کہ جب اہل شہر کے سب اس پر مجتمع ہو جائیں کہ کوئی شخص ان میں قضا کا والی نہ ہو تو سب کے سب گنہگار ہوں گے۔

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

علامہ ابن حجرؒ کا فتویٰ

فاذا خلت بلدا وقطر عن نفوذ وامر السلطان فيها لبعدها وانقطاع اخبارها عنه وعدم انقيادا اهلها لاوامره لوبلغتهم فلم يرسل لهم قاضيا وجب على كبراء اهلها ان يولوا من يقوم باحكامهم ولا يجوز لهم ان يتركوا الناس فوضى لان ذلك يؤدى إلى ضرر عظيم۔

الخ۔ (فتاویٰ کبریٰ)

جب کوئی شہر یا نواح سلطان کے نفوذ اور امر سے اس بنا پر خالی ہو جائے کہ وہ شہر دور ہے یا سلطان کی خبر یہاں تک نہیں پہنچ سکتی ہے یا باوجود (خبر پہنچنے کے یہاں کے لوگ سلطان کے احکام کی تابعداری نہیں کرتے ہوں؛ اس لئے سلطان نے بھی قاضی نہ بھیجا ہو تو وہاں کے ذمہ دار لوگوں پر واجب ہے کہ ایسے شخص کو جو ان کے احکام شرعی کو انجام دے" والی منتخب کرلیں"، اور ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ لوگوں کو پراگندہ بلا والی کے چھوڑ دیں؛ اس لئے کہ یہ نقصان عظیم کو متلزم ہوگا۔

علامہ لخمی مالکی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

قال اللخمی اقامة الحكم للناس واجب لانه امر بالمعروف ونهى عن المنكر فعلى ولى الامر ان ينظر فى احكام المسلمين ان كان اهلاً او يقيم للناس من ينظر فان لم يكن للموضع ولى امر كان ذلك لذوى الراى والثقة فما اجتمع رايهم عليه ان يصلح اقاموه انتهى۔

(الحطاب، ص:۹۹، ج:۶)

علامہ لخمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ لوگوں کے لئے حاکم کا قائم کرنا واجب ہے، اس لئے کہ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں داخل ہے۔ والی پر واجب ہے کہ اگر اہلیت رکھتا ہے تو وہ خود مسلمانوں کے معاملہ میں غور وفکر کرے یا کسی شخص کو اس کام کے لئے مقرر کرے کہ وہ غور وفکر کرے اور اگر کسی جگہ امیر نہ ہو تو اہل الرای اور قابل اعتماد لوگوں کے ذمہ میں ہے کہ جس پر ان سب کی رائے مجتمع ہو جائے کہ یہ اس لائق ہے تو اس کو قائم کریں (یعنی امیر بنائیں)۔

علامہ ابوالحسن اصبحی شافعیؒ کا فتویٰ

اذا عدم فى قطر ذو شوكة وحاكم ولم يوجد للمرأة ولى ولا للاطفال وصى ونحوه فهل لجماعة من اهل البلاد نصب فقيه يتعاطى الاحكام فى الابضاع والاموال فاجاب الاصبحى رحمه الله بقوله نعم۔ اذا لم يكن رئيس يرجع امرهم اليه اجتمع ثلاثة من اهل الحل والعقد و نصبوا قاضيا۔

(فتاویٰ کبریٰ)

(سوال کیا گیا) کہ جب ملک کے کسی نواح میں حاکم نہ رہے اور عورتوں کے لئے ولی اور بچوں کے لئے وصی اور اسی طرح کے دوسرے امور کے لئے اسکے ذمہ دار نہ رہیں تو کیا شہر کے لوگوں میں سے کسی جماعت کو یہ اختیار ہے کہ قاضی نصب کریں؟ جو لوگوں کے ناموں اور اموال کے احکام کو انجام دے تو علامہ اصبحی نے جواب دیا کہ ہاں جب کوئی امیر نہ رہے جو ان کے شرعی معاملات کا مرجع اور مرکز ہو تو اہل حل وعقد لوگوں میں سے تین شخص جمع ہو جائیں اور قاضی کا تقرر کرلیں۔

قاضی جمال الدین بن ظہیرؒ کا فتویٰ

قد سئل القاضى جمال الدين بن ظهير عما اذا كانت قرية من القرى واهلها يملك كبارهم الحل والعقد فيها دون غيرها فهل يصح نصبهم لرجل يمضى بينهم بعض ما يمضى الحاكم وقد اظهروا له الطاعة فيما يقربهم من الله سبحانه وتعالىٰ وبايعوه على ذلك

قاضی جمال الدین رحمۃ اللہ سے سوال کیا گیا کہ اگر کوئی ایسا مقام ہو جہاں کے اکابر اس مقام میں حل وعقد کے مالک ہوں اور دوسری جگہ ان کا اثر نہ ہو تو کیا ایسے مقام میں ان اکابر حل وعقد کا کسی شخص کو والی مقرر کرنا کہ وہ ان احکام کو نافذ کرے جو ایک مسلمان حاکم (مولی من السلطان یا خلیفہ) جاری کرتا ہے اور ایسے والی کی اطاعت کا اظہار ان ارباب حل وعقد نے ان امور میں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

وهو معتقد منهم عدم الوفاء ثم لم يفوا بالاكثر او بالجميع هل ينفذ منه ما ينفذ من الحاكم۔ من تزويج المجنونة۔ وبيع مال المديون لحق الغرماء وحفظ اموال اليتامیٰ والبيع لهم والشراء بالمصلحة واشباه ذلك ومايشترط فيه فی نفسه ومالا يشترط۔

کیا جو تقرب الی اللہ کا باعث ہو اور اس پر ان لوگوں نے بیعت کی؛ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس شخص کو یقین ہے کہ یہ لوگ اپنے اقرار کو پورا نہیں کرینگے پھر واقعہ بھی یونہی ہوا کہ اکثر لوگوں نے پورا نہیں کیا یا تمام لوگوں نے پورا نہیں کیا کیا اس کی جانب سے وہ احکام نافذ ہوں گے جو حاکم کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں؛ مثلاً شرعاً مجنونہ کا نکاح، مدیون کے مالک کا بحق غرما بیع کردینا یتامی کے اموال کی حفاظت کرنا اور مصالح کی بنا پر اس کے لئے بیع وشرا کرنا اور اسی طرح کے دوسرے امور نافذ ہوں گے؟

فاجاب بانه يجوز للكبار المذكورين ان يولوا قاضيا فی القرية المذكورة يحكم بين الناس واذافعلوا ذلك صح ونفذت احكامه وصح تزويج المجنونة وغيرها وبيع مال المديون عند امتناعه وتحفظ مال اليتيم ويتصرف فيه ويحفظ اموال الغائبين ويتولیٰ جميع ما يتولاه الحكام۔

(فتاویٰ کبریٰ)

تو قاضی صاحب علیہ الرحمۃ نے جواب دیا کہ ان بڑے لوگوں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ ان قریوں میں قاضی مقرر کریں جو لوگوں کے مابین فیصلہ کرے اور جب وہ ایسا کرینگے تو یہ فعل ان کا صحیح ہوگا اور اس قاضی کے احکام نافذ ہوں گے اور اس مجنونہ وغیرہ کی ترویج اور مدیون کے مال کا مدیون کی ادائیگی سے رک جانے کی صورت میں بیع کرنا صحیح ہوگا اور وہ یتیم کے مال کی حفاظت کریگا اور اس میں تصرف کریگا اور غائب لوگوں کے مال کی بھی حفاظت کریگا اور ہر ان امور کا والی ہوگا جسکے حکام والی ہوتے ہیں۔

نواب صدیق حسن خانؒ والیٔ بھوپال کا فتویٰ

عن عبداللّٰه بن عمران النبی صلی اللّٰه عليه وسلم قال: لايحل لثلاثة يكونون بفلاة من الارض الاوامروا عليهم احدهم

(رواه احمد)۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایسے تین شخصوں کے لئے جو زمین کے کسی گوشہ میں زندگی گذارتے ہیں، حلال نہیں ہے، مگر یہ کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالیں، روایت کیا اس کو امام احمد بن حنبل نے۔

واخرج نحوه البزاز باسناد صحيح من حديث عمر بن الخطاب بلفظ اذا كنتم ثلاثة فی سفر فامروا احدكم۔ ذالک امير امره رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم واخرج البزاز باسناد صحيح من حديث ابن عمر مرفوعًا بلفظ اذاكانوا ثلثة فی سفر فليومروا احدهم واخرجه بهذا للفظ الطبرانی من حديث ابن مسعود باسناد صحيح وهذه الاحاديث يشهد بعضها لبعض وعن ابی سعيدان رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم قال: اذاخرج

اور اسی طرح کی ایک حدیث بزاز نے صحیح سند سے بروایت خلیفہ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان لفظوں میں تخریج کی ہے کہ جب تم تین آدمی سفر میں ہو تو اپنے میں سے ایک شخص کو امیر بنالو۔ یہ ایسا امیر ہوگا جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا ہے۔ پھر بزاز نے اس حدیث کو بسند صحیح بہ طریق مرفوع حضرت عبد اللہ بن عمر سے ان لفظوں میں تخریج کی ہے کہ جب تین آدمی سفر میں ہوں تو ان پر لازم ہے کہ ایک کو امیر بنالیں اور ان ہی الفاظ میں طبرانی نے بسند صحیح حضرت عبداللہ ابن مسعود سے تخریج کی ہے اور یہ سب احادیث ایک دوسرے کی شاہد ہیں اور حضرت ابو سعید سے روایت ہے کہ جب تین آدمی سفر میں نکلیں تو ان پر واجب ہے کہ تین میں

Scanned with CamScanner

ثلثة فی سفر فلیؤمروا علیھم احدھم رواہ ابو داؤد والمنذری عن حدیث ابی سعید وابی ھریرۃ وفیھا دلیل علی انه یشرع لکل عدد بلغ ثلثة فصاعدا ان یؤمروا علیھم احدھم؛ لان فی ذلک السلامة من الخلاف الذی یؤدی الی التلاف فمع عدم التأمیر یستبدکل واحد برایه ویفعل ما یطابق ھواہ فیھلکون ومع التأمیر یقل الخلاف و تجتمع الکلمة۔

واذاشرع ھذا لثلثة یکونون فی فلاۃ من الارض اویسافرون فشرعیته لعدد اکثر یسکنون القری والامصار ویحتاجون لدفع التظالم وفصل التخاصم اولی واحری۔ وفی ذلک دلیل لقول من قال انه یجب علی المسلمین نصب الائمة والولاۃ والحکام۔

(ظفر الملاضی بما یجب فی القضاء علی القاضی، ص:۹)

سے ایک کو امیر بنالیں۔ روایت کی اس کو ابوداؤد نے اور منذری نے بھی حضرت ابو سعید اور حضرت ابوہریرہؓ سے۔

ان احادیث میں اس پر دلیل ہے کہ اس تعداد کے لئے جو تین ہوں۔ یا تین سے زیادہ ہوں ان کیلئے مشروع ہے کہ وہ ایک آدمی کو امیر بنالیں۔ اس لئے کہ اس میں اس اختلاف سے جو بربادی تک پہنچادیتا ہے۔ سلامتی ہے۔ اس لئے کہ امیر نہ ہونے کی صورت میں ہر شخص اپنی رائے میں مستبد ہوگا اور جو اس کی خواہش کے موافق ہوگا کریگا؛ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ برباد ہوجائینگے اور امیر ہونے کی وجہ سے اختلاف میں کمی ہوگی اور کلمہ میں اجتماع ہوگا۔

اور جب امیر بنانا ایسے تین شخصوں کے لئے جو دنیا کے کسی گوشہ میں ہوں یا مسافرت میں ہوں مشروع ہے تو اس سے زیادہ تعداد کے لئے جو گاؤں اور شہروں میں رہتے ہوں اور ظلم اور جھگڑوں کے دفع کرنے میں محتاج ہوں اس کی مشروعیت زیادہ اولیٰ اور احری ہے اور اس حدیث میں اس شخص کے قول کی دلیل ہے کہ امام اور والی اور حاکم کا نصب کرنا مسلمانوں پر واجب ہے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ کا فتویٰ

واقامت جمعه در دارالحرب اگر از طرف کفار والی مسلمان در مکانے منصوب باشد باذن او درست والا مسلمانان را باید که یک کس را که امین و متدین باشد رئیس قرار دہند که باجازت وحضور واقامت جمعه واعیاد۔ وانکاح من لاولی من الصغار وحفظ مال غائب وایتام وقسمت ترکات متنازع فیھا علی حسب السہام می نمودہ باشد بے آنکه در امور ملکی[2] تصرف کند ومداخلت نماید۔

(فتاویٰ عزیزی، جلد اول، ص:۳۲)

اگر کفار کی طرف سے مسلمان والی[1] دارالحرب کے کسی مکان میں مقرر ہو تو اس والی مسلم کی اجازت سے جمعہ قائم کرنا درست ہے؛ ورنہ مسلمانوں کو چاہئے کہ ایک امین اور دیندار شخص کو سردار (والی) خود ہی مقرر کریں اور اس کے حکم سے جن نابالغوں کا کوئی والی نہ ہو نکاح پڑھایا جاوے اور غائب اور یتیموں کے مالوں کی حفاظت کی جائے اور موافق حصص شرعیہ ان ترکات کی تقسیم کی جائے جس میں نزاع ہو سوا اس بات کے، کہ (حکومت کافرہ کے) ملکی کاموں میں مداخلت اور تصرف والی کو نہیں کرنا چاہئے۔

---

۱ یعنی مسلم والی جو احکام وقوانین کفرہ کے اجراء پر مجبور نہ ہو، بلکہ احکام وقوانین اسلام کے اجراء میں آزاد ہو (اگر دارالحرب میں منجانب حکومت کافرہ مقرر ہو۔)

۲ اس جگہ ایک بات ضروری سمجھ لینے کی یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے ''حکومت کافرہ مسلط'' کے ہوتے ہوئے قوم کے منتخب کردہ والی اور امیر کو جو اس امر سے منع کیا ہے کہ وہ حکومت کافرہ کے امور ملکی میں کوئی مداخلت کرے تو یہ منع از قبیل، باب استصلاح یعنی اس کی بنا رعایت مصلحت شرعی اور وقتی پر ہے اور یہ ان ظروف واحوال پر مبنی ہے جب کہ حکومت کافرہ شخصی یا غیر آئینی ہو؛ جس میں باشندگان ملک کو حکومت کے نظام اور کاروبار میں کسی قسم کا کوئی دخل نہ ہو، جیسا کہ اس ملک میں انگریزی راج کا ابتدائی دور تھا کہ ملک کے

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

مولانا شیخ یوسف بن قادر احمد کا فتویٰ مع تصدیق حضرت مولانا عبدالحیٔ صاحب علیہ الرحمۃ لکھنوی

فاذا علمت هذا فيجب ان يجتهد ويلتمس اهل كل بلدة واليًا وان يتفقوا عليه حتى يقيم بهم الجمعة والاعياد۔ ويزوج الايتام وجاء فى الحديث من مات ولم يول على نفسه امامًا مات موتة جاهلية ثم لايخفىٰ ان كل بلدة وقرية فى بلادنا لم يخل من

............پس جب تمہیں یہ معلوم ہو گیا (یعنی جو کچھ پہلے لکھا گیا ہے تو یہ معلوم کرو کہ) ہر اہل بلد کے لئے واجب ہے کہ کوشش کرے اور ایک والی کی جستجو کرے اور اس پر اہل بلد متفق ہو جائیں؛ تاکہ اس کی وجہ سے جمعہ اور عیدین قائم ہوں اور وہی والی یتیموں کا نکاح پڑھاوے (یعنی جس کا

انتظامی اور عدالتی قوانین کے بنانے میں اور نافذ کرنے کے معاملات میں اہل ملک کے رایوں کی کوئی پرسش نہ تھی۔ خالص ستبد انگریزی حکومت تھی۔

ایسی حالت میں صرف مسلمانوں کے والی کا حکومت کے ظالمانہ ملکی امور میں مداخلت کرنا اور تمام اہل ملک کے لئے منصفانہ برتاؤ یا کاروائی کے لئے کوئی اقدام کرنا، اسلامی جماعتی نظام کے قیام میں اشکال پیدا کر سکتا تھا اور حکومت کافرہ والی کے نظام کو نہ صرف یہ کہ قیام سے روک سکتی؛ بلکہ اس کو برباد کر سکتی تھی، اس شرعی مصلحت سے جناب شاہ صاحبؒ نے اس وقت "باب اصلاح" کے اصول پر یہ فرمایا کہ "بے آنکہ در امور ملکی تصرف کند و مداخلت نماید"۔

لیکن جب حالات سازگار ہوں اور خود حکومت کافرہ نے جمہوری اصول پر حکومت کا ایک ڈھانچہ تیار کیا ہو؛ جس میں باشندگان ملک کی رایوں کو خاص اہمیت حاصل ہو تو اس صورت میں والی مسلم کا امور ملکی سے بے تعلق رہنا مضر ہو سکتا ہے؛ کیونکہ اسلامی جماعتی مفاد کی نگہداشت

وال ورئيس فى الزمان المتقدم لكن فى هذا الزمان وقع بين اهله التخالف والافتراق ولم يوجد القضاة الانادرا فينبغى ان يجتمعوا ويتفقوا على وال واحد حتے يقيم به الجمع والاعياد ويزوج الأيتام لان الوالى كالسلطان فلايجوز السلطان الاواحد الانه جاء فے الحديث اذا بويع للخليفتين فاقتلوا اُخر

کوئی ولی نہ ہو) اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ جس شخص نے اپنے نفس پر کسی کو والی نہیں بنایا اور مر گیا تو اسکی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ پھر مخفی نہ رہے کہ ہمارے ملک کا کوئی شہر اور گاؤں گذشتہ زمانہ میں والی مسلم سے خالی نہ تھا، لیکن اس زمانہ (چودہویں صدی) میں اہل زمانہ کے مابین پھوٹ اور اختلاف وقع ہوا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قضاۃ کا وجود نہیں رہا الا شاذ و نادر (مثلاً حیدرآباد، بھوپال) پس لائق ہے کہ

ایک دیندار اور اس کی جماعت ہی کر سکتی ہے دوسرے نہیں کر سکتے۔

اس لئے شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کے فتوی کے آخری جملہ سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ شاہ صاحب نے والی مسلم کو سیاسی امور میں مداخلت سے ہمیشہ کے لئے بہر صورت منع کیا ہے؛ کیونکہ اسلامی سیاست کا اقتضا تو یہ ہے کہ پورے ملک پر عدل وانصاف کی حکومت قائم ہو اور قوانین الٰہیہ کا نفاذ ہو اور یہی وہ مقصد ہے جس کے پورا کرنے کے لئے قیام امارت اور ولایات اسلامیہ کی ضرورت ہے پھر اس کو ہمیشہ کے لئے کس طرح شجر ممنوعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

آخر شاہ صاحب نے اپنے فتوی میں جن چند اسلامی اجتماعی امور کو انجام دینا والی کا فریضہ قرار دیا ہے وہ بھی تو حقیقۃً قانونی حیثیت سے سیاسی امور ہیں، مثلاً یتیم بغیر ولی کا والی بنانا یا بنانا، حکومت کے قانون میں جج کا فریضہ ہے ترکہ متنازعہ فیہ کی عادلانہ تقسیم وغیرہ بھی حکومت کافرہ کے قوانین کے ماتحت اس کے حکام کے فرائض میں داخل ہیں اور حکومت کے کاروبار کا ایک حصہ

Scanned with CamScanner

منهما فكذا الوالي فليجتنب عن الوالي الآخر والله تعالىٰ اعلم بالصواب۔ كتبه احقر العباد شيخ يوسف بن قادر احمد عفي عنهما صح الجواب والله اعلم حرره الراجي عفو ربه القوي ابو الحسنات محمد عبدالحي تجاوز الله عن ذنبه الجلي والخفي۔	مسلمان کسی ایک والی پر مجتمع اور متفق ہو جائیں۔ تاکہ اسکی وجہ سے جمعہ اور عیدین قائم ہوں۔ اور وہی والی لاوارث یتیموں کا نکاح پڑھائے۔ اس لئے کہ والی بادشاہ کے مثل ہے۔ پس بادشاہ (ایک ملک میں) ایک ہی ہوگا؛ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو جس کی بیعت متاخر ہو اس کو مار ڈالو (اگر توبہ نہ کرے) پس یہ حکم والی کے متعلق بھی ہے۔ لہٰذا ایک والی کے ہوتے ہوئے دوسرا والی بنانے سے احتراز کیا جائے۔
(مجموعہ فتاویٰ ص [illegible] مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جلد سوم کتاب القضاء)	

ہے اور یہ سب معاملات اصطلاحاً سیاسی امور میں شامل ہیں۔ مگر ان ہی کاموں کو شاہ صاحب علیہ الرحمۃ منتخب والی کا فریضہ قرار دیتے ہیں جسکے معنی ہوئے کہ اسلامی مفاد کے لئے جن سیاسی امور میں والی کو مداخلت کا موقع ہو، اس سے گریز نہ کرے۔

✲

مسئلہ امارت

تاریخی واقعات کی روشنی میں

شرعی حیثیت سے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کے بعد ہم تاریخی حیثیت سے بھی چند الفاظ عرض کر دینا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ہم بلفظہ علامہ سید سلیمان ندوی صاحب کے خطبۂ صدارت سے جو ممدوح نے جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس ہفتم کلکتہ میں پڑھا تھا، ذیل کا اقتباس پیش کرتے ہیں:۔

"مسلمانوں کی تاریخ میں کیا ایسے واقعات نہیں کہ انہوں نے اپنی محکومی اور عدم استطاعت کی حالت میں بھی ایک نوع کی تنظیمی مرکزیت قائم رکھی چھٹی صدی میں جب کافر تاتاریوں نے ایران و خراسان و ترکستان پر قبضہ کر لیا تو علمائے وقت نے اس کے لئے مسلمان والی کا مطالبہ پیش نہیں کیا؟ جو آج ہماری کتب فتاویٰ کا ایک باب ہے، اس وقت بھی جب مسلمانوں کا اوج اقبال تھا تجارتی ضرورتوں سے ان کو غیر اسلامی سلطنتوں میں آمد و رفت اور سکونت اختیار کرنی پڑتی تھی؛ لیکن ان کی اسلامی تنظیمی وحدت کا سررشتہ یہاں بھی ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا تھا۔ تیسری صدی ہجری میں مسلمان تاجروں کی نوآبادی چین کے شہر خانقو میں تھی۔ مگر وہ کس طرح رہتے تھے، اور ان کے احکام و معاملات کیونکر فیصل پاتے تھے۔ سلیمان تاجر اپنے تیسری صدی ہجری کے سفرنامہ میں لکھتا ہے:

ان بخانقو وهو مجمع التجار رجلا مسلما يوليه صاحب الصين الحكم بين المسلمين الذين يقصدون الىٰ تلك الناحية يتوخى ملك الصين ذلك واذا كان في	شہر خانقو (چین) میں مسلمان تاجروں کا مرکز ہے ایک مسلمان ہے جس کو شاہ چین ان مسلمانوں کے درمیان فصل احکام کے لئے مقرر کرتا ہے جو اس ملک میں جاتے ہیں شاہ چین ان کو چاہتا ہے اور عید جب آتی ہے

العید صلّٰی بالمسلمین وخطب ودعالسلطان المسلمین وان التجار العراقیین لاینکرون من ولایته شیئا فی احکام وبما فی کتاب اللّٰہ عزوجل واحکام الاسلام۔

(۱۴؍مطبوعہ پیرس ۱۸۱۱ء)

تو وہ والی مسلمانوں کی نماز کی امامت کرتا ہے اور خطبہ پڑھتا ہے اور بادشاہ اسلام کے لئے دعا کرتا ہے اور عراقی تاجر مسلم والی کی ولایت کے کسی حکم اور عمل بالحق کا انکار نہیں کرتے اور نہ ان حکموں سے سرتابی کرتے ہیں جو اس والی نے کتاب الٰہی اور احکام اسلام کے موافق جاری کیا ہو۔

عراقیوں کی فارسی زبان میں اس مسلمان والی اور قاضی کا نام ہنرمند تھا جو عام استعمال میں ہنرمن بولا جاتا تھا۔ خود ہندوستان کے مختلف ساحلی شہروں میں جہاں جہاں مسلمان آبادیاں تھیں، یہ ہنرمند غیر اسلامی سلطنتوں میں اسلامی تنظیم وقضا کے ذمہ دار نظر آتے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے جہاز ران بزرگ ابن شہریار اپنے سفرنامہ ''عجائب الہند'' میں صیمور (مدراس کے قریب) میں عباس ابن بامان سیرانی ہنرمند کا تذکرہ کرتا ہے۔

انہ کان بصیمور رجل من اھل سیراف یقال لہ العباس ابن ھامان وکان ھُنرمن للمسلمین بصیمور ذووجہ البلد والمنضوی الیہ من المسلمین۔ ص:۴۲)

صیمور میں سیراف کا ایک شخص تھا جس کو عباس ابن بامان کہتے تھے۔ اور جو وہاں کے مسلمانوں کا ہنرمند تھا اور شہر کا ذی وجاہت اور وہاں کے پناہ گزیں مسلمانوں کا مرکز تھا۔

اسی مقام میں ۳۰۴ھ میں مشہور سیاح مسعودی پہنچتا ہے، وہ کہتا ہے:۔

علی الھنرمن یومئذ ابوسعید معروف ابن زکریا والھنرمنۃ یرادبہ رئیس المسلمین وذلک

ہنرمندی کے منصب پر ان دنوں ابوسعید معروف بن زکریا تھا اور ہنرمند سے مراد رئیس المسلمین ہے اور اس کی صورت یہ ہے

ان الملک یملک علی المسلمین رجلا من رؤسائھم تکون احکامھم مصروفۃ الیھم۔

(مروج الذہب، ص:۸۶، ج:۲، یورپ)

کہ راجہ مسلمانوں پر ان کے رئیسوں میں سے ایک افسر بنا دیتا ہے مسلمانوں کے تمام کے تمام مقدمات اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

حضرات یہ تو گذشتہ عہد کا بیان تھا۔ آج مسیحی طاقتوں کے ماتحت جہاں مسلمان آباد ہیں کسی نہ کسی حیثیت سے اس قسم کی تنظیم جاری ہے۔ ابھی نو پید املک پولینڈ کے مسلمانوں کا ذکر کر چکا ہوں۔ بوشویک روس میں بھی مسلمان قازان کی مجلس دینیہ اسلامیہ کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ خود ہندستان میں سلاطین کے عہد میں صدر جہان کے نام سے اس قسم کا عہدہ قائم تھا جس کے ماتحت تمام قضاۃ ومحتسب وائمہ ہوتے تھے۔ تاتاری کافروں کے استیلاء کے زمانہ میں اس عہد کے علماء نے اسی بناء پر مسلمان والی کے پہلو پر زور دیا۔

حضرات اس قسم کے نظم ملت سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کی وحدت نمایاں ہو ان کے تمام مذہبی وملی کام منظم ہوں۔ ان کی ضرورتیں پوری ہوں۔ ان کے مصارف مداخل ملی میں ایک نظم پیدا ہو، اور اصلی جماعتی روح ان میں نمایاں ہو۔ دار الافتاء دار القضا اور بیت المال کا قیام ہو، ان کے غریبوں اور محتاجوں کی باقاعدہ امداد ہو، ان کی معاشرتی خرابیوں کی اصلاح ہو۔ تبلیغ واشاعت کا سلسلہ قائم ہو، ان کے مکاتب ومدارس مالی نزاع سے نجات پائیں۔

نظم ملت کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے تمام اعلیٰ وادنیٰ طبقے نکاح وطلاق وراثت کی سخت معاشرتی مشکلات میں ہیں۔ آجکل آپ میں سے جن اصحاب کے پاس ملک کے اطراف سے فتوے آتے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ اعلیٰ طبقہ کی عورتیں خلع کے رواج پذیر نہ ہونے کے باعث کس قدر مصیبت میں ہوتی ہیں، ظالم شوہروں سے نجات پانے کے لئے، انتہا یہ ہے کہ اعلیٰ خاندان کی عورتیں شومی قسمت سے تبدیل مذہب تک کی جرأت کرلیتی ہیں، نیچے طبقے کی مسلمان عورتوں میں فوری وبدعی طلاق کی صورتیں مفقود الخبری عدم ادائے نفقہ اور فسخ نکاح کی

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

متعدد صورتیں پیش آتی ہیں، جن کے علاج سے ہم اس "نظم امارت" کے بغیر قطعاً مجبور ہیں۔ کیا امت محمدیہ کی یہ حالت علمائے کرام اور مسلمانوں کی توجہ کے لائق نہیں۔ اوقاف کی بے ترتیبی مساجد کی کس مپرسی،۔ اماموں کی جہالت اصلاح کی محتاج نہیں۔

(خطبۂ صدارت اجلاس ہفتم جمعیۃ علماء ہند ص ۵۸)

امیر کی حیثیت

اس مسئلہ کے طے ہوجانے کے بعد کہ دارالحرب میں (جہاں مسلمانوں کی زندگی حکومت کافرہ کے زیر اقتدار محکومانہ اور مغلوبانہ ہوتی ہے) مسلمانوں پر ایک والی کا نصب اور اقامت واجب ہے، اصولاً یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ اس امیر کو یا فقہاء کی اصطلاح میں والی کو کیسا ہونا چاہئے۔

اس کے متعلق ہر سمجھدار انسان میرے اس خیال کی تائید کرے گا کہ اس کا معیار محض یہ ہونا چاہئے کہ جن دواعی اور ضرورتوں کے تحت والی کا انتخاب کیا جائے اس کے انتظام وانصرام کی پوری صلاحیت اس میں موجود ہو" پس اس معیار واصول پر دارالحرب کے اندر مسلم والی کو کیسا ہونا چاہئے؟ اس کا فیصلہ بالکل سہل ہے، اور وہ یہ ہے کہ آپ اپنی ان کل شرعی ضرورتوں کو ایک ایک کرکے اپنے سامنے لائیں، جن کو دارالکفر کے اندر حکومت کافرہ سے شرعاً حاصل نہیں کرسکتے ہیں پس یہی چیزیں مناط کار ہیں جن کی انجام دہی کے نقطۂ نظر سے مسلم والی کا مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کی پسندیدگی سے انتخاب ہوگا۔ اس کے علاوہ جو زائد خصوصیات اس میں ہوں گی، وہ بحالت موجودہ اس منصب کی جہت سے غیر ضروری ہوں گی، اور اس طرح کے زائد خصوصیات کو جن کا دواعی سے تعلق نہیں ہے، والی کے لئے ضروری ٹھہرانا غلط ہوگا۔

دواعی کا مسئلہ کہ وہ کیا ہیں؟ اس کے متعلق مجملاً تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ ہماری وہ شرعی ضرورتیں ہیں، جن کو ہم حکومت غیر مسلمہ کے کافر والی سے شرعاً حاصل نہیں کرسکتے ہیں تفصیل کے درجہ میں بعض چیزوں کی تشریح حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ کے الفاظ میں ملاحظہ ہو مولانا حکومت غیر مسلمہ کے اندر مسلم والی کے انتخاب اور اس کے حدود کار کے متعلق تحریر

فرماتے ہیں:

یک کس را کہ امین ومتدین باشد رئیس قرار دہند کہ باجازت وحضور او اقامت جمعہ واعیاد نکاح من لاولی من الصغار وحفظ مال غائب وایتام وقسمت ترکات متنازع فیہا علی حسب السہام می نمودہ باشد بے آنکہ در امور ملکی تصرف کند ومداخلت نماید۔

مسلمان ایک امین اور دیانتدار شخص کو سردار (والی) مقرر کریں تاکہ اس کی اجازت اور موجودگی سے جمعہ اور عیدین کی نماز قائم کریں، اور اس کے حکم سے جن نابالغوں کا کوئی ولی نہ ہو نکاح پڑھایا جائے اور غائب اور یتیموں کے مال کی حفاظت کی جائے اور حسب سہام شرعی ان ترکات کی تقسیم کی جائے، جن میں جھگڑا ہوگیا ہو، بجز اس بات کے کہ والی سلطنت کے ملکی امور میں کوئی مداخلت اور تصرف نہ کرے۔

حاصل یہ کہ مسلم والی حکومت کافرہ کے خاص ملکی امور میں کسی طرح کی مداخلت کئے بغیر مسلمانوں کے ان امور کو انجام دے گا، جن کا شرعی حیثیت سے حکومت کافرہ کے کافر والی سے حاصل ہونا غیر ممکن ہے۔ جن کی بعض صورتیں شاہ صاحب قدس سرہ کے فتوے میں مذکور ہیں اور جن کا مفاد یہ ہے کہ اس والی کے لئے شعبۂ دارالقضاء شعبۂ بیت المال وشعبۂ نظم مساجد وغیرہ کا قائم کرنا ضروری ہے۔

والی کی شرعی حیثیت

باقی یہ بحث کہ ان امور کو جو شخص انجام دے گا، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ جو شخص دارالکفر میں مسلمانوں کا والی بنایا جائے گا اس کی ولایت حیثیت آئین اسلامی کی رو سے کیسا ہوگی؟ اس کے متعلق فتح القدیر کی یہ تصریح گذر چکی ہے کہ

یولی قاضیا اویکون ھو الذی یقضی بینھم۔ (فتح القدیر، ص: ۳۶۵)

Scanned with CamScanner

یعنی وہ شخص جس کو امت والی بنائے گی اور اپنی جانب سے ولایت سپرد کرے گی اس کو شرعاً اس کی ولایت ہوجائے گی کہ وہ ان کے مقدمات کے انفصال کے لئے قاضی مقرر کرے اور وہ امت کے درمیان مقدمات کا فیصلہ کرے، یا وہ خود ان کے مقدمات کا انفصال اپنے ہاتھ میں رکھے، اور فیصلہ کرے۔

نیز حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ امت کے مقرر کردہ والی کو آئین اسلامی کی رو سے اس کی ولایت حاصل ہوجائے گی کہ اپنے حکم سے جمعہ اور عیدین کی اقامت کرے، ان نابالغوں کا جن کا کوئی والی نہ ہو، ولی بنکر نکاح کرے، غائب شخص اور یتیموں کے مال کی حفاظت کرے اور ترکہ متنازعہ فیہ کی عادلانہ تقسیم کرے۔

اس پر مستزاد یہ کہ حضرت مولانا عبدالحئی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ سے معلوم ہو چکا ہے کہ اس والی کی شرعی حیثیت ''سلطان'' کے ایسی ہوگی اور شرعاً اس کو اس کی ولایت حاصل ہوجائے گی کہ وہ جمعہ اور عیدین کا قیام کرے اور یتیموں کا اپنی ولایت سے نکاح پڑھائے، ان کے فتوے کے الفاظ یہ ہیں:

''حتی یقیم ھوالجمعة والاعیاد. ویزوج الیتامی. لان الوالی کالسلطان''۔

اسی طرح شامی میں بھی یہ تصریح ہے کہ ان مقامات میں جو کسی سلطان کے تحت نہ ہوں بلکہ ان ہی کا کوئی شخص ان پر امیر ہو، چاہے اس طرح پر کہ وہ شخص غلبہ کی وجہ سے ان پر حاکم بن گیا ہو، یا یہ کہ وہ شخص ان کے اتفاق رائے سے ان پر امیر ہو۔ بہر دو صورت اس امیر کی حیثیت سلطان کی ہوگی اور اس کی طرف سے قضاء کی تولیت صحیح ہوگی۔ یعنی وہ اپنی ولایت سے قاضی مقرر کرے گا اور قاضی ان کے مقدمات کا فیصلہ کرے گا۔

''ثم ان الظاھر ان البلاد التی لیست تحت حکم سلطان؛ بل لھم امیر منھم. مستقل بالحکم علیه بالتغلب او باتفاقھم

علیه یکون ذلک الامیر فی حکم السلطان فیصح منه تولیة القضاء علیھم''۔ (شامی، ص:۳۳۹، ج:۴)

بہر حال اس والی کی حیثیت جس کو امت والی بنا کر اپنی طرف سے ولایت سپرد کرتی ہے، اس کی شرعی حیثیت آئین اسلامی کی رو سے اس سلطان کے ایسی ہوتی ہے جو ماتحت خلیفہ ہوتا ہے، اس کی حیثیت خلیفہ یا امیر المومنین یا امام اعظم کی نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ آئین اسلامی میں سلطان اور خلیفہ دو جداگانہ منصب ہیں سلطان غیر خلیفہ ہوتا ہے، خلیفہ نہیں ہوتا ہے؛ جیسا کہ شامی کی یہ تصریح اس پر ناطق ہے۔

''وھذا ظاھر فی اختصاص تولیة القضاء بالسلطان ونحوہ کالخلیفة''۔ (شامی کتاب القضاء)

مسئلہ کے انشراح اور توضیح کے لئے کہ کس مناط پر فقہاء نے دار الحرب کے والی کے متعلق مذکورۃ الصدر امور کی تصریح کی ہے۔ حضرت استاذی مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کا وہ جواب یہاں نقل کر دینا مناسب ہوگا جو حضرت مولانا نے حضرت مولانا قیام الدین عبدالباری صاحب فرنگی محل لکھنو رحمۃ اللہ علیہ کے حسب ذیل سوال کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔ ان دونوں بزرگوں کا یہ مفاوضہ طبع شدہ ہے۔

سوال: امیر شریعت کا منصب امام اعظم کا ہے۔ یا وہ والی ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یا نائب خلیفہ ہے خواہ بمنزلہ قاضی (ملخصاً)

جواب:- امیر شریعت امام اعظم نہیں ہے، جس کی ولایت عامہ تمام ممالک اسلامیہ کو محیط ہوتی ہے، بلکہ وہ والی ہے اور اس کی ولایت عامہ ان بلاد وقریہ کو محیط ہوتی ہے کہ جس کی ولایت اس کے سپرد کی گئی ہو۔

اگر اس والی کا تقرر امام اعظم کی طرف سے ہو تو تفویض ولایت، امہ از جانب امام ہوگی

Scanned with CamScanner

اوراس صورت میں اس ولایت کے ماتحت مسلمانوں کواس والی کے عزل ونصب میں کوئی اختیار نہیں ہے، اوراس لئے ایسی صورت میں اس والی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی اصلا حاجت نہیں ہے، کیونکہ اس والی کی اطاعت امام اعظم کی بیعت کی وجہ کر فرض ہے اور ایسا والی امام اعظم کا نائب ہے، حقیقۃً بھی اور صورۃً بھی۔ حقیقۃً اس سبب سے کہ وہ اپنی ولایت کے دور میں ان فرائض کا ذمہ دار ہے جو امام اعظم کا ہے۔ اور صورۃً اس لئے کہ خلیفہ نے ولایت عامہ اس کے سپرد کی ہے۔

اور اگر والی کا تقرر از جانب امام نہ ہو، بلکہ قوم نے از خود ولایت عامہ کسی شخص کے سپرد کر کے والی بنایا ہو، جیسا کہ بہار میں ہوا ہے۔ تو اس صورت میں اس کی بیعت اسی طرح لازم ہے جس طرح امام اعظم کی بیعت[1] لازم ہے، اور یہ والی اپنے حدود ولایت میں حقیقۃً اور حکماً قائم مقام امام اعظم اور نائب امام اعظم ہے، اگرچہ صورۃ قائم مقام اور نائب امام اعظم نہیں ہے۔ کیونکہ امام اعظم نے اس کو مقرر نہیں کیا، اس لئے صورت سے تو وہ نائب نہیں ہوا؛ لیکن حقیقۃً اور شرعاً قائم مقام اور نائب ہے، اس لئے کہ وہ امت کی طرف سے اسی ولایت عامہ کے منصب پر فائض ہے، جس منصب پر امام اعظم کو یا اس کے مقرر کردہ کسی شخص کو ہونا چاہئے۔

اس کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی تفصیل فرمائی ہے پھر اس کے بعد لکھا ہے
پس حقیقتاً جمہور امت حاکم، آمر، ناہی، ہوتی ہے اور اس کا قائم کردہ امام اعظم یا والی اس اعتبار سے امت کا نائب ہوتا ہے، اس لئے امت ہی کو عزل ونصب کا اختیار ہے۔

پس جو کچھ امام اعظم یا والی احاد امت میں تصرفات قوانین شرع کے ماتحت کرتا ہے وہ محض اس وجہ سے ہے کہ امت نے یہ کام اس کے سپرد کیا ہے الخ (انتہی)

---

[1] بیعت سے مراد معاہدہ ہے یعنی اقرار سمع وطاعت علامہ ابن حجرؒ نے فتح الباری کتاب الایمان میں حدیث بیعت عبادہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کے شرح کے ماتحت لکھا ہے **والمبائعة عبارة عن المعاهدة** اسی طرح عمدۃ القاری میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے عبدالملک بن مروان کو اس کے خلیفہ ہونے کے بعد جو خط لکھا تھا اس کے الفاظ یہ تھے: **اقرك بالسمع والطاعة**)

ان تصریحات کے بعد اس...... والی کے متعلق یہ سمجھنا، جیسا کہ بعض تحریر میں دیکھا گیا ہے کہ اس کی شرعی حیثیت اس موجودہ ہندوستان میں حکم سے زیادہ نہیں ہے، سراسر غیر فقہی بات ہے۔ کیونکہ حکم نہ تو تقلید قضا کر سکتا ہے نہ خود "**یقضی بینھم**" کا فریضہ ادا کر سکتا ہے، حکم تو صرف ایک مختص امر کے لئے ہوتا ہے اور وہ بھی صرف بین الخصمین؛ جس کو امت کی طرف سے ولایت عامہ کی سپردگی نہیں ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے فقہاء نے دار الحرب کے والی کے لئے تقلید قضاء اور مذکورۃ الصدر امور کی انجام دہی کا فریضہ بیان کیا ہے، جو اس امر کی دلیل ہے کہ والی دار الحرب حکم نہیں ہے۔ بلکہ وہ شرعاً والی ہے جس کو امت کی طرف سے ولایت عامہ سپرد کی گئی ہے اور فقہاء نے اس کی حیثیت کالسلطان لکھا ہے۔

پھر کوئی ذی علم حکم کو والی کے برابر کیسے سمجھ سکتا ہے جب کہ حکم کی حیثیت شرعی قاضی کے برابر نہیں ہے بلکہ اس سے فروتر ہے چنانچہ فقہ کی کتابوں میں بلا اختلاف یہ تصریح موجود ہے کہ حَکَم کا مرتبہ قاضی سے فروتر اور کمتر ہے، اس لئے کہ قاضی کی ولایت عام ہے یعنی اس کا حکم اور فیصلہ امت کے ان تمام افراد پر عام ہے، جس حلقہ کا وہ قاضی بنایا گیا ہے، اور حَکَم کا حکم فقط اس پر مخصوص ہے جس نے اس کو حَکَم مانا ہے۔ اور جب حَکَم اس قاضی سے فروتر ہوا جو والی کے ماتحت ہوتا ہے تو وہ حکم "والی" کے برابر کیسے ہوگا۔ اور کوئی ذی علم ایسی بات کہنے کی کیسے جرأت کر سکتا ہے۔ شامی میں باب التحکیم کے تحت میں لکھا ہے۔ "**لما کان من فروع القضاء وکان احط رتبة من القضاء اخره**"۔

عنایہ میں ہے "**ان الحکم ادنی مرتبة من القاضی لاقتصار حکمه علی من رضی بحکمه وعموم ولایة القاضی**"۔

پھر آئین اسلامی کی رو سے یہ کیسے درست ہو سکتا ہے اور کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ حکم جس کی تحکیم مسلمانوں کے لئے آئین اسلامی کی رو سے نہ فرض ہے، نہ واجب ہے، نہ سنت مؤکدہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک مشروع امر ہے۔ وہ دار الحرب کے اس والی کے برابر ہو جس کا

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

نصب اور قیام آئین اسلامی کی رو سے واجب ہے۔

پھر جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، مستزاد یہ کہ مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی تحقق کے لئے والی کا قیام ضروری ہے، اور بغیر اس کے انفرادی زندگی شارع علیہ السلام کے نزدیک عاصیانہ زندگی ہے، اور اس پر موت، جاہلیت کی موت ہے، کیا حکم کے متعلق بھی یہ کہا جائے گا کہ بغیر اس کی تحکیم کو عمل میں لائے ہوئے مسلمانوں کی زندگی عاصیانہ ہوگی، اور اسی حالت پر موت، اس کی موت ''جاہلیت کی موت'' ہوگی۔ اگر یہ نہیں کہا جائے گا اور نہیں کہا جا سکتا ہے، تو پھر یہ کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے کہ والی دار الحرب کی شرعی حیثیت حکم سے زیادہ نہیں ہے۔

دار الحرب کے والی کی شرعی حیثیت سے قرآن مجید کی بصیرت کی روشنی میں قارئین کتاب کی بصیرت کے لئے ایک سرسری بحث پیش کردوں۔ **وما توفیقی الا باللہ العظیم۔**

ولایت کی حقیقت

ولایت کی حقیقت کے متعلق میں سب سے پہلے علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی آزادرائے پیش کرتا ہوں جن کی ذہنیت کا فرقہ وارانہ جذبات سے پاک ہونا ارباب علم کا تسلیم شدہ مسئلہ ہے، اور جو بلاخوف لومۃ لائم شدت سے محض ظاہر قرآن وحدیث کو بغیر کسی توڑ مروڑ کے اپنی بحث کے لئے مناط ٹھہرانے میں بعض لوگوں کی نظر میں یک گونہ معتوب بھی ہیں۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

الولایۃ لہا رکنان؛ القوۃ والامانۃ فالقوۃ فی الحکم ترجع الی العلم بالعدل بتنفیذ الحکم والامانۃ ترجع الی خشیۃ اللہ تعالیٰ۔
(اختیارات ابن تیمیہ ص ۱۹ مع المجلد الرابع فتاویٰ ابن تیمیہ)

ولایت کے دو رکن ہیں۔ قوت اور امانت احکام شرعیہ کے فیصلے کے بارے میں قوت کے اعتبار کا حاصل یہ ہے کہ شرعی فیصلے کو عدل کیساتھ نافذ کرنے کی اس میں بصیرت اور علم ہو۔ اور امانت کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خشیت ہو۔

یعنی ولایت کا دارومدار والی کے فرائض اور خدمات کے لحاظ سے دو امروں پر ہے۔

ایک قوت دوسرے امانت، لہٰذا فیصلہ میں قوت سے مراد یہ ہے کہ عدل سے احکام کے نافذ کرنے کا اس کو علم ہو، اور امانت سے مراد یہ ہے کہ اس کے دل میں خدا کی خشیت ہو، یعنی خوف خدا سے اس کا دل اتنا معمور ہو کہ وہ اپنے فرض منصبی میں خیانت سے کام نہ لے۔

والی کی حیثیت کے متعلق قرآن کا معیار

ولایت کے رکن کے متعلق علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس تعیین کا ماخذ نہ معلوم ان کے وسیع معلومات میں کیا تھا۔ مگر میرے نزدیک اس تعیین پر کھلا ہوا استدلال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے، جو قرآن مجید کے سورۂ قصص میں مذکور ہے کہ:

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے اتفاقاً ایک قبطی خطاءً مر گیا۔ تو ایک شخص کے مشورہ کی بناء پر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعونیوں کے خوف سے مدین پہنچے، اور وہاں پہنچ کر حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ اور ان کی ایک لڑکی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بکریوں کی چرواہی کی خدمت پر ملازم رکھنے کی سفارش کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس استحقاق پر ایک کلی دلیل ضابطہ کی شکل میں یہ بیان کی کہ میں ان کو ملازم رکھنے کے لئے اس لئے کہتی ہوں کہ جس کسی کو بھی آپ نوکر رکھیں گے، اس کے لئے بہتر وہی شخص ہوگا جو قوی اور امین ہو۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں:

فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٚ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۡ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝
(القصص: ۲۶-۲۵)

جب موسیٰ (علیہ السلام) ان کے (یعنی حضرت شعیب کے) پاس پہنچے اور ان سے اپنا حال بیان کیا تو انہوں نے کہا اندیشہ نہ کرو، تم ظالموں سے بچ آئے۔ پھر ان کی دو لڑکیوں میں سے ایک لڑکی نے کہا، ابا جان ان کو نوکر رکھ لیجئے، اس لئے کہ جس کسی کو بھی آپ نوکر رکھیں گے، بہتر سے بہتر وہی شخص ہوگا جو قوی اور امین ہو۔

Scanned with CamScanner

اس گفتگو میں باعتبار مقصد کے گرچہ خاص خدمت پیش نظر تھی، مگر چونکہ تعبیر میں مطلق ملازمت ہے، اور اس مطلق ملازمت کے لئے مطلق دلیل بیان کی گئی ہے اور بغیر کسی تخصیص کے مطلقاً عہدہ کے استحقاق کے لئے دو چیزیں بطریق معیار کے بیان کی گئی ہیں، اس لئے اس آیت سے اس ضابطہ اور قاعدہ کلیہ کا استدلال کرنا واضح امر ہوگا کہ قرآن مجید کی بصیرت کی روشنی میں ہر عہدہ کے لئے بہتر اور اہل اور سزاوار وہ شخص ہوگا جو اس عہدہ کی خدمت اور اس عہدہ کے فرائض کے انجام دینے کی قوت اور امانت اپنے اندر رکھتا ہو۔ لہٰذا ہر عہدہ اور ہر طرح کی ولایت اور ہر نوع کی خدمت کیلئے جب کسی کا تقرر یا انتخاب پیش نظر ہو تو اس انتخاب میں ان ہی دونوں معیاروں سے کام لیا جائے گا۔

قوت کے معنی قہر نہیں ہیں

حاصل یہ ہے کہ ہر عہدہ کے والی کی حیثیت میں قوت اور امانت اسی عہدہ کی خدمات اور فرائض کے لحاظ سے اعتبار کیا جائے گا۔ نہ یہ کہ قوت کے معنی ہر جگہ مادی طاقت، فوجی قوت اور قہر و اکراہ اور اجبار و الزام کے لئے جائیں گے؛ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت یکہ و تنہا تھے۔ اور بفحوائے

فَخَرَجَ مِنۡهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِىۡ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ۔
(القصص:۲۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام معاملہ پر نگاہ رکھتے ہوئے ہراسان نکلے (اور) خدا سے دعا کی کہ میرے پروردگار مجھ کو ظالم لوگوں سے نجات دے۔

فرعونیوں کے ڈر سے ہراساں اور ترساں تھے، اور مادی سامان کا یہ حال تھا کہ مدین پہنچ کر جب ایک سایہ میں بیٹھے تھے تو اپنے فقر و احتیاج کو بارگاہ الٰہی میں ان لفظوں میں بیان کیا تھا:-

ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَىَّ مِنۡ خَيۡرٍ فَقِيۡرٌ۔
(القصص:۲۴)

پھر موسیٰ علیہ السلام ایک سایہ کی طرف چلے گئے اور خدا سے دعا کی کہ میرے پروردگار جو نعمت بھی میرے لئے بھیج دے میں (اس کا) محتاج ہوں۔

درماندگی اور پریشانی کا حال یہ تھا کہ ایک مزدور کی حیثیت سے اپنے پانی پلانے کی مزدوری لینے کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

قَالَتۡ اِنَّ اَبِىۡ يَدۡعُوۡكَ لِيَجۡزِيَكَ اَجۡرَ مَا سَقَيۡتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيۡهِ الۡقَصَصَ ۙ
(القصص:۲۵)

میرے والد تم کو بلا رہے ہیں کہ وہ تم کو اس بات کی مزدوری دیں کہ تم نے ہماری خاطر (ہماری بکریوں کو پانی) پلا دیا ہے تو جب (موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس پہنچے اور ان سے اپنا حال بیان کیا الخ۔

لیکن باوجود ان کل باتوں کے جب ان کی چرواہی کی ملازمت کی سفارش کی گئی تو ان کے استحقاق پر جو چیز حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں پیش کی گئی وہ ان کی قوت اور امانت تھی۔

پھر وہ کونسی قوت تھی جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے استحقاق ملازمت میں حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی نے حضرت شعیبؑ کی خدمت میں پیش کیا تھا تو ہر شخص یہ تسلیم کرے گا کہ یہ وہی قوت تھی جس کی اس ملازمت میں ضرورت تھی اور جس کو ان لڑکیوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

مدین کے کنویں پر ایسی حالت میں کہ یہ اپنی بکریوں کو الگ روک کر کھڑی ہوئی تھیں اور دوسرے چرواہوں کے پلانے کا انتظار کر رہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کھینچ کر ان کی بکریوں کو پلا دیا تھا۔ جس سے لڑکیوں نے سمجھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات میں جانوروں کے پانی پلانے کا علم اور اس علم کے ساتھ قوت فیصلہ موجود ہے کہ یہ کام کس طرح انجام پا سکتا ہے اور وہ خود اس کام کے کرنے پر قادر ہیں اور امانت کا اندازہ اس سے کیا ہوگا کہ پانی پلانے کی بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لڑکیوں سے الگ ہو کر ایک درخت کے سایہ میں جا کر مناجات الٰہی میں مشغول ہو گئے تھے جو خشیت الٰہی کی صریح علامت ہے۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۫ وَ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَ اَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ۝ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ۝

(القصص: ۲۳-۲۴)

جب موسیٰ علیہ السلام مدین کے کنویں پر پہنچے تو دیکھا کہ کنویں پر ایک بھیڑ ہے (جو اپنے جانوروں کو) پانی پلا رہے ہیں۔ اور دیکھا کہ ان لوگوں سے الگ دو عورتیں (اپنی بکریوں کو) روکے کھڑی ہیں (موسیٰ علیہ السلام نے) پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے وہ بولیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانوروں کو ہٹا نہ لے جائیں ہم پانی نہیں پلا سکتے اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں (یہ سنکر حضرت موسیٰ نے ان کے لئے (ان کی بکریوں کو) پانی پلا دیا۔ پھر ہٹ کر ایک سایہ میں جا بیٹھے اور خدا سے دعا کی کہ میرے پروردگار جو نعمت بھی میرے لئے بھیج دے میں اس کا محتاج ہوں۔

الحاصل قرآن مجید کی بصیرت کی روشنی میں ہر طرح کے عہدے، ہر طرح کی ولایت کے لئے دو صفتوں کا ہونا ضروری ہے، ایک تو قوت یعنی ادائے خدمت پر قدرت، دوسری امانت یعنی اس کی ادائیگی میں خشیت الٰہی نہ کہ قوت قاہرہ اور سطوت عسکریہ اور آلات حربیہ اور ذخائر مادیہ۔

میری اس تصریح پر کہ قرآن مجید کی روشنی میں ہر طرح کی ولایت کے لئے چاہے وہ سلطنت ہی کی ولایت کیوں نہ ہو۔ ذات والی کے اندر محض دو وصف قوت و امانت کی حاجت ہے اور ذخائر مادیہ اور قوت قاہرہ اور سطوت عسکریہ اور حربیہ اس کی ولایت کی حقیقت سے خارج ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ بعض زاویۂ فقاہت سے غلط اجتہاد کی بنا پر یہ ہنگامہ برپا کیا جائے کہ موسیٰ علیہ السلام کی چرواہی پر ولایت اور امارت کو قیاس کیا گیا ہے اور چرواہی کے منصب کو ولایت اور امارت کے منصب کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ عموم اور وسعت ولایت کے اعتبار سے ان دونوں میں

جتنا فرق ہے اتنا ہی ان دونوں کی قوت و امانت میں بھی فرق ہونا چاہئے؛ لہٰذا امامت اور امارت کی قوت میں قوت قاہرہ اور سطوت عسکریہ اور ذخائر مادیہ کی شرط ضرور ہونی چاہئے۔

تو اس کے متعلق میں بہ ادب عرض کروں گا کہ ایک تو موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں جس آیت سے استدلال کیا گیا ہے وہ دلیل کلی اور ضابطہ کی شکل رکھتی ہے اور اس میں کسی خاص ولایت ومنصب کا تذکرہ نہیں ہے، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، دوسرے یہ کہ اگر تشفی اور اطمینان کے لئے یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید کی صریح آیتوں میں یہ دکھلا دیا جائے کہ ملوکیت جو عموم ولایت اور وسعت اختیار کے اعتبار سے انسان کے مادی عروج وصعود کی انتہائی منزل ہے۔ اس کے والی کی ذات میں بھی ذخائر مادیہ اور سطوت عسکریہ اور قوت قاہرہ کی موجودگی لازم نہیں ہے تو قرآن مجید میں یہ بھی مذکور ہے۔ مگر افسوس کہ ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

مادی طاقت ولایت امارت کے لئے شرط نہیں ہے

سورۂ بقرہ میں نبی اسرائیل کے تذکرے میں جہاں اور بہتیرے واقعات مذکور ہیں، ایک واقعہ یہ ہے کہ جب یہ لوگ اس طرح تباہ و برباد کئے گئے کہ اپنے بال بچوں اور گھروں سے نکالے گئے اور بے وطن اور بے خانماں کر دیئے گئے تو اس وقت کے موجودہ نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی خدمت میں ارباب حل وعقد اور اہل الرائے لوگوں کی ایک جماعت وفد کی حیثیت سے اس درخواست کے لئے حاضر ہوئی کہ ہمارے لئے ایک ملک کا انتخاب کر دیجئے تا کہ ہم اس کی قیادت میں ظالموں سے جہاد کریں۔

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ۔ (البقرۃ:۲۴۶)

(اے پیغمبر) تم نے بنی اسرائیل کی اس جماعت (کی حالت پر) جو موسیٰ کے بعد تھی نظر نہیں کی؟ ایک زمانہ میں انہوں نے اپنے (وقت کے) نبی سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے ایک امیر مقرر کردیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال (جہاد) کریں۔

اس کے بعد اس وفد اور ان کے نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) میں اس معاملہ کے متعلق جو کچھ بحث ومباحثہ ہوا، وہ یہ ہے:-

قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَآ أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَآئِنَا۔ (البقرۃ:۲۴۶)

اللہ کے نبی نے کہا اگر تم پر قتال (یعنی جہاد) فرض کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ تم نہ لڑو۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے گھروں اور اپنے بال بچوں سے تو نکالے جاچکے (اب) ہمارے لئے کونسا عذر ہے کہ خدا کی راہ میں نہ لڑیں۔

اس کے بعد فرمان الٰہی کے مطابق اس وقت کے نبیؑ نے جب اس وفد کو یہ فیصلہ سنایا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت طالوت کا اس منصب کے لئے انتخاب ہوا ہے تو ان لوگوں نے انکار کردیا کہ ہم لوگ ان کو کسی طرح اپنا امیر نہیں تسلیم کرسکتے ہیں، وجہ انکار میں دو باتیں پیش کیں، ایک تو یہ کہ ان کی ذات کونسا شاہی خاندان سے تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا یہ مستحق امارت نہیں ہوسکتے، دوسرے یہ کہ یہ مالی اقتدار نہیں رکھتے جس سے ذخائر حربیہ اور آلات حرب مہیا ہوسکتے ہیں، لہٰذا ایسا شخص جو فقیر ومسکین ہو اور لوازم شاہی اور ذخائر مادی اور شوکت وہیبت سلطانی نہیں رکھتا ہو، سزاوار امارت کا نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے اس سوال وجواب کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:-

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ۔ (البقرۃ:۲۴۷)

اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا یعنی (امیر بنایا اسپر) ان لوگوں نے کہا کہ اس کو ہم پر کیونکر حکومت مل سکتی ہے اس سے تو حکومت کے ہم ہی زیادہ حقدار ہیں اور اس کو تو مالی وسعت بھی نہیں ہے۔

ان اعتراضوں کا جواب ان کے نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے یہ دیا کہ پہلی بات کہ طالوت شاہی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے ہیں، لہٰذا بادشاہ نہیں ہوسکتے ہیں؛ اس لئے غلط ہے کہ اس مسئلہ میں وراثت کوئی چیز نہیں ہے؛ بلکہ اہلیت کا اعتبار ہے اور خدا نے ان کا انتخاب ان کی اہلیت کی بنا پر کیا ہے؛ لہٰذا وہ امیر ہوں گے دوسری بات یہ کہ طالوت علیہ السلام مال ودولت نہیں رکھتے ہیں جس پر اقتدار شوکت وجاہت دنیوی کا دارومدار ہے، اور مال ودولت سے توپ وتفنگ اور باضابطہ فوج وپولیس کا سامان مہیا ہوسکتا ہے تو یہ چیزیں ولایت امارت کے لئے معیار نہیں ہیں۔ یعنی خدا کے ہاں اسکا اعتبار نہیں ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ بلکہ حکومت کا معیار یہ ہے کہ حاکم کی ذات میں دو صفت ہوں؛ ایک قوت، دوسرے علم (جس کو خشیت الٰہی لازم ہے) اور بس۔

قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔ (البقرۃ:۲۴۷)

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے تم لوگوں پر اسی کو پسند فرمایا ہے اور (مال میں نہیں تو) علم میں اور جسم (یعنی قوت) میں اسکو فراخی دی ہے، اور اللہ اپنا ملک جس کو چاہے دے۔ اور اللہ بڑی وسعت والا اور بہت علم رکھنے والا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس سے پہلے ''ان خیر من استاجرت القوی الامین'' کے ذیل میں یہ ملاحظہ سے گزر چکا ہے کہ مطلقاً ہر منصب کے عہدہ کے لئے معیار قوت اور امانت ہے اور یہاں آپ کے سامنے یہ ہے کہ حضرت طالوت علیہ السلام کے منصب ملوکیت کے لئے معیار قوت اور علم کو قرآن مجید نے ان کے مخالفین کے سامنے پیش کیا اور یہ بظاہر قرآن مجید کے دو بیانوں کے اندر اختلاف کو مستلزم ہے۔

تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ دونوں بیان میں جو بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے،

Scanned with CamScanner

دراصل اختلاف نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید کے تنوعات بیان کا یہ عام انداز بیان ہے جس کا سمجھنا قرآن مجید کی ممارست پر مبنی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ رسمی قابلیت کے ارباب پندار کے لئے ہمیشہ یہ چیز سخت ٹھوکر ثابت ہوئی ہے، مشکل یہ ہے کہ اس موقعہ میں اس علمی مسئلہ پر نہ مفصل بحث ہوسکتی ہے، نہ عوام کے زاویۂ نگاہ میں اس کی گنجائش وسعت ہے۔

پھر بھی تفصیلی بحث سے اس مضمون کو تشنہ رکھنے کے باوجود اس مسئلہ کی طرف موقع کی خصوصیت کو سامنے رکھتے ہوئے ایک اجمالی اشارہ کر دینا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں، لیکن ان اصحاب کی خدمت میں جو اختلاف تعبیرات کے حجاب میں حقیقت مستورہ تک پہنچنے سے قاصر ہوں، ان کی خدمت میں ہم باادب یہ عرض کریں گے کہ آپ محض اتنا سمجھیں کہ قرآن مجید صاف اور واضح لفظوں میں ملوکیت (امارت) کی ولایت کے لئے ذخائر مادیہ کو معیار قرار نہیں دیتا ہے۔ اور قوت عسکریہ کو شرط نہیں ٹھہراتا ہے کیونکہ طالوت علیہ السلام کو باوجود اس کے کہ ان کو مالی وسعت نہ تھی، خدا تعالیٰ نے ان کو ملک (یعنی امیر) بنایا۔ اور بنی اسرائیل کے اعتراض کی کوئی پروانہ کی۔ ''و کفی باللہ شہیدا''۔

قرآن مجید کے انداز بیان کے متعلق ایک علمی نکتہ

قرآن مجید کے طرز خطاب کا یہ عام انداز ہے کہ اگر قرآن مجید ایک ایسی حقیقت کو جو اپنے ساتھ لوازم بھی رکھتی ہے، ایک جگہ صراحت کے ساتھ ایک خاص تعبیر میں ادا کرتا ہے تو اکثر پھر اسی حقیقت کو جب دوسری جگہ پیش کرتا ہے تو تعبیر میں ایسے الفاظ اختیار کرتا ہے کہ پہلے موقع میں جو لوازم خفیہ کی حیثیت رکھتے تھے، ان کو اس دوسرے موقع میں آنکھوں کے سامنے عیاناً اور صراحۃً لاکر رکھ دیتا ہے۔ اور پہلے موقع میں جو صراحۃً عبارت میں پیش کردیئے گئے تھے، ان کو اس دوسرے موقع میں التزامی تعبیر میں لے آیا جاتا ہے تاکہ دونوں آیتیں مل کر انسان کی فراست ایمانی کی بصیرت کے لئے کامل درس اور سبق ہو جائیں اور الفاظ وعبارت کے پردہ میں جو حقائق محجوب ومستور ہوں وہ منصۂ شہود وظہور پر آجائیں ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

اسی اصول پر گذشتہ آیت کے لفظ قوت، امانت پر غور کیجئے۔ بظاہر آپ کے سامنے عبارت وتعبیر میں دو لفظ قوت وامانت ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر صفت علم ملحوظ نہیں ہے، حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ اس مقام پر قوت اور استعداد مع العلم مقصود ہے؛ کیونکہ جب کسی چیز کے انجام دینے کی آپ میں قوت موجود ہے اور آپ اس کو انجام دینے کے قابل ہیں تو اس کے لازمی معنی یہ ہیں کہ آپ اس سے واقف ہیں اور اس کے انجام دینے کا علم رکھتے ہیں اس لئے علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے القوۃ فی الحکم کی تفسیر کرتے ہوئے علم کا ذکر کیا اور اہل نظر کو اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ والی کے اندر جس کی ولایت اس کو دی جائے گی۔ اس خدمت کے انجام دینے کی اس میں قوت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا علم ہو؛ تاکہ جو کچھ انجام دے وہ علم اور یقین کی روشنی میں انجام دے، اور علم کے ماتحت قوت فیصلہ رکھتا ہو۔

پس گذشتہ آیت میں جہاں لفظ قوتؔ، امانتؔ کا صراحۃً ذکر ہے۔ وہاں قوت میں علم ملحوظ ہے اور دوسری آیت میں جب اسی حقیقت کو حضرت طالوتؑ کی ملوکیت (امارت) کے موقع میں دوسری تعبیر میں بیان کیا گیا تو اس کو ''بسطۃ فی العلم والجسم'' کی تعبیر میں پیش کیا گیا۔ اور لفظ علم وجسم ارشاد فرمایا گیا یعنی بجائے لفظ امانت کے لفظ علم اور بجائے قوت لفظ کے جسم استعمال کیا گیا۔ اس لئے کہ علم کے لئے بحکم اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (فاطر، ع:۴، پ:۲۲)۔ خشیت الٰہی لازم ہے؛ لہٰذا یہاں امانت (یعنی خشیت الٰہی) علم کے ساتھ ملحوظ ہے۔ پس بسطۃ فی العلم و الجسم، میں علم کے ساتھ خشیت سمجھی گئی اور جسم کے لفظ سے قوت سمجھی گئی؛ جس کا حاصل یہ ہوا کہ ملوکیت (امارت) کے لئے بھی قوت اور امانت (یعنی خشیت الٰہی) اصلی معیار اہلیت وصلاحیت ہیں۔

الحاصل تنوعات تعبیر سے حقیقت نہیں بدلی اور ہر جگہ اہلیت مناصب کے لئے قوت اور امانت کا ہونا ضروری قرار دیا گیا، پس پہلی تعبیر میں اور دوسری میں ارباب فکر کے لئے حقیقۃً اصل مقصود میں بال کے برابر بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

اس مقام میں ایک نکتہ یہ بھی ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ ہر منصب کے لئے اسکی قوت کی جو شرط ہے، تو اس قوت کا مصداق مختلف مناصب کی حیثیت سے مختلف ہوگا۔ امارت اور ولایت عامہ میں علم بالرای والتدبیر اور عزیمت کا ہونا قوت کا مصداق ہوگا۔ منصب قضاء میں علم باحکام القضاء اور علم بالعدل وتنفیذ القضاء قوت کا مصداق ہوگا۔

امیر الجیش کے لئے اصابت رائے کے ساتھ شجاعت اور بہادری قوت ہے اور چونکہ عموماً شجاعت اور بہادری جسمانی صلاحیت واستعداد سے زیادہ تر نمایاں ہوتی ہے۔ اس لئے طالوت کی اہلیت "ملوکیت" جو امارت الجیش کو بھی مشتمل تھا اور فوری طور پر یہی چیز نمایاں طور پر قوم کے پیش نظر تھی، اس کے بیان میں صفت قوت کو لفظ "**بسطة فی الجسم**" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بخلاف بکریوں کی چرواہی اور سقایۃ (پانی پلانا) کے لئے کہ اس میں جسمانی بساطت کی چنداں ضرورت نہیں ہے، بلکہ صلاحیت تدبیر اور علم الرعایہ والسقایۃ کی ضرورت ہے، اس لئے وہاں اصل حقیقت کو لفظ "قوت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی طرح امیر الجیش کے لئے بلحاظ اس کے کہ وہ جہاد وقتال کے شرعی اور مذہبی احکام سے واقف ہو اور اس کے ساتھ اس میں خشیت الٰہی بھی ہو؛ تا کہ جہاد میں قساوت قلبی اور شقاوت کی راہ مسدود ہو جائے، یعنی علوم ظاہری بھی اس میں نمایاں ہو؛ اس لئے یہاں دوسری صفت کو لفظ امانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

عود الی المقصود

الحاصل قرآنی بصیرت کی روشنی میں ملوکیت اور امارت کی ولایت کے لئے نہ ذخائر مادیہ کی شرط ہے، نہ شوکت وقہاریت کی؛ لہٰذا ملوکیت کی ولایت کے لئے مادی اور مالی طاقت کو شرط اور شوکت وقہاریت کو ضروری امر قرار دینا نہ خدا کی کتاب کا حکم ہے، نہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا، بلکہ بنی اسرائیل کی ایک ناسمجھ جماعت کی رائے تھی؛ جو ملوکیت کو خاندانی ترکہ سمجھتی تھی اور اس کے لئے

مادی سامان کا ہونا ضروری قرار دیتی تھی اور جس کے خیال کی اصلاح قرآن مجید میں مذکور ہے۔

پس آج مسلمانوں کے سامنے دو راہیں موجود ہیں۔ وہ یا تو خدا کے نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے حکم کی پیروی کریں اور یہ سمجھیں کہ قرآنی بصیرت کی روشنی میں امارت کی ولایت کے لئے مادی طاقت اور مادی شوکت اور مادی قہاریت ضروری نہیں ہے؛ بلکہ اہلیت کی حاجت ہے یا وہ بنی اسرائیل کی اس گمراہ جماعت کی پیروی کریں جو ملوکیت کے لئے مادی طاقت اور مادی شوکت کو ضروری قرار دیتی تھی اور اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ کہہ کر جھگڑتی تھی کہ ایسا شخص کیسے ہمارا امیر اور حاکم ہوسکتا ہے، جس کو کچھ بھی مالی وسعت حاصل نہیں ہے۔

والی کی حیثیت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معیار

معیار ولایت کے متعلق قرآن مجید کی روشنی میں جس طرح ہم نے دو واقعے سے استدلال کیا ہے۔ احادیث نبوی کی روشنی میں بھی بحث کے سلسلہ میں ہم بہ نظر اختصار دو واقعہ سے استدلال کریں گے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا واقعہ!

عن ابی ذر قال قلت یا رسول اللہ الا تستعملنی قال فضرب بیدہ علی منکبی ثم قال یا اباذر انک ضعیف وانہا امانۃ وانہا یوم القیامۃ خزی وندامۃ الا من اخذہا بحقہا وادی الذی علیہ فیہا۔ (رواہ مسلم)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ مجھکو کیوں نہیں حاکم بنا کر بھیجتے ہیں۔ حضرت ابوذر کہتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے مونڈھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ ابوذر! تم ضعیف ہو اور یہ امارت امانت ہے اور یقین کرو کہ قیامت کے دن یہ امارت رسوائی اور ندامت ہوگی؛ لیکن اس شخص کے لئے نہیں جس نے اس کو اس کے حق کے ساتھ اختیار کیا اور اس امارت کے بارے میں جو اس پر ذمہ داری ہے، اس کو ادا کیا۔

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

اس حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ کا حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی درخواست امارت کو نامنظور کرنے کی وجہ یہ فرمانا کہ تم ضعیف ہو، ولایت کے معیار اول ''طاقت'' کی طرف اشارہ ہے کہ یہ چیز تم میں نہیں پائی جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد آپ کا یہ اشارہ فرمانا کہ ''انها امانة'' یہ امارت امانت ہے۔ ولایت کے معیار دوم ''امین'' ہونے کی طرف اشارہ ہے اور یہ دونوں چیزیں وہی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں قرآن مجید سے معلوم ہو چکی ہیں کہ وہ معیار ولایت قوت وامانت قرار دیتا ہے۔ **فنعم الوفاق۔**

یہ خطرہ یاد رہے کہ ضعیف ہونے کے معنی اس حدیث میں یہ ہیں کہ حضرت ابوذرؓ قوت قاہرہ اور مادی سطوت نہیں رکھتے تھے، اور اسی بنا پر ان کی درخواست نامنظور ہوئی؛ اسی طرح غلط ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں قوت کے معنی مادی طاقت، فوجی طاقت، یا قہر و اکراہ کے لینا غلط تھا۔ کیونکہ جس طرح حضرت ابوذرؓ مادی سطوت اور طاقت نہیں رکھتے تھے، اسی طرح صحابہ کرام کی وہ جماعت بھی نہیں رکھتی تھی جن کو حضور ﷺ امیر بنا کر اپنی طرف سے بھیجا کرتے تھے اور اگر یہ کہا جائے کہ جن امراء کو حضور ﷺ بھیجا کرتے تھے، گرچہ وہ حضرات خود مادی سطوت نہیں رکھتے تھے، لیکن حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سطوت ان کی پشت پر ہوتی تھی۔ تو پھر یہ بات تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے کہ وہ والی ہوتے تو حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلام کی طاقت ان کے جلو میں ہوتی۔

اتمام حجت کے لئے ہم ایک اور دوسرا واقعہ اس امر کی شہادت میں پیش کر کے اس بحث کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

حضرت حذیفہؓ کا واقعہ!

عن حذيفة قال كان الناس يسئلون رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الخير وكنت اسأله عن الشر مخافة ان يدركني۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے خیر و برکت کی باتیں پوچھتے تھے۔ اور میں اس ڈر سے کے فتنہ و شر میں مبتلا نہ ہو جاؤں، شر و فتن کو پوچھتا رہتا تھا۔

قال: قلت: يارسول الله! انا كنا في جاهلية وشر فجاءنا الله بهذا الخير فهل بعد هذا الخير من شر قال: نعم قلت وهل بعد ذلك الشر من خير قال: نعم وفيه دخن وقلت: وما دخنه قال: قوم يستنون بغير سنتي ويهدون بغير هدي تعرف منهم و تنكر۔ قلت: فهل بعد ذالك الخير من شر قال: نعم دعاة على ابواب جهنم من اجابهم اليها قذفوه فيها۔ قلت: يارسول الله! صفهم لنا قال هم من جلدتنا ويتكلمون بالسنتنا قلت: فما تامرني ان ادركني ذلك قال: تلزم جماعة المسلمين وامامهم۔ قلت فان لم يكن لهم جماعة ولا امام قال فاعتزل تلك الفرق كلها وان تعض باصل شجرة حتى يدرك الموت وانت على ذلك۔ (رواہ بخاری ومسلم)

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں، کہ میں نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! ہم لوگ زمانہ جاہلیت اور شر میں تھے اس کے بعد خداوند تعالیٰ نے یہ خیر عنایت فرمایا تو کیا اس خیر کے بعد بھی شر ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں میں نے پھر پوچھا، کہ کیا اس شر کے بعد پھر خیر کا زمانہ آئے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں مگر حال ہوگا کہ وہ خالص خیر نہیں ہوگا بلکہ اس میں گدلا پن ہوگا میں نے پوچھا کہ وہ گدلا پن کیا ہوگا؟ فرمایا کہ ہمارے طریقہ کے خلاف طریقہ اختیار کیا جائے گا تم ان میں اچھی باتیں بھی پاؤ گے۔ اور بری باتیں بھی پاؤ گے۔ میں نے پوچھا کہ کیا اس خیر کے بعد بھی شر ہوگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں بہت سے لوگ جہنم کے دروازے پر کھڑے ہو کر دعوت دیں گے۔ جو شخص ان کی دعوت کو قبول کرلے گا ان کو جہنم میں ڈال دیں گے، میں نے عرض کیا کہ ان کی صفت بیان فرمادی جائے۔ فرمایا کہ وہ ہمارے ہی قبیلے کے لوگ ہوں گے اور ہماری ہی زبان بولیں گے۔

میں نے عرض کیا کہ پھر ہمارے لئے آپ کیا حکم فرماتے ہیں۔ اگر یہ شر ہم کو پائے۔ تو آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام کی معیت اپنے اوپر لازم کرلینا پھر میں نے عرض کیا کہ اگر مسلمانوں کی جماعت اور امام کا وجود نہ ہو؟ تو آپ نے فرمایا، جماعت اور امام کے نہ ہونے کی صورت میں تمام فرقوں سے الگ رہیو۔ اگرچہ تم کو درخت کی جڑ چبانا پڑے یعنی آبادی سے الگ ہو کر رہنا پڑے یہاں تک کہ اسی حالت میں تم کو موت آجائے۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اس حدیث سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اسلامی زندگی جماعتی زندگی کا نام ہے۔ اور مسلمانوں کی جماعت اور اس کے امام کے ساتھ رہنا واجب ہے اور افتراق وتشتت، اور مطلق العنانی اور پراگندگی کی زندگی سے رہبانیت کی زندگی بہتر ہے؛ حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ سراسر غیر محمود؛ بلکہ ناروا ہے۔ اور قرآن مجید کا حکم ہے:

وَ رَهْبَانِيَّةَ ۣابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ ۔الخ

یعنی رہبانیت تو (نصاری نے) جو گڑھ لیا تھا ہم نے رہبانیت ان پر فرض نہیں کیا تھا؛ بلکہ ہم نے تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ان پر فرض کی تھی۔ (الحدید: ۲۷)

نیز اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اس امیر کے ساتھ وابستہ رہ کر بھی جماعتی زندگی گذارنا واجب ہے جو اپنے احکام کی تنفیذ کے لئے مادی طاقت، فوجی قوت اور دنیاوی وجاہت وسطوت نہیں رکھتا ہو؛ کیونکہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو جس امام کے ساتھ رہنے کی تعلیم دی جاتی ہے وہ ایسے زمانہ میں ہے کہ جس زمانہ میں کثرت سے ٹولیاں بنی ہوئی ہیں، نیز جہنم کی دعوت دینے والوں کی کثرت ہے، جو آزادی کے ساتھ گمراہی کی دعوت دے رہے ہیں، جماعت حقہ اور اس کے امام وامیر میں اتنی مادی طاقت نہیں ہے کہ وہ ان گمراہوں کو شرارت وفتنہ بازی سے روک سکے۔

مگر باوجود اس کے حضور ﷺ کا حضرت حذیفہؓ کو حکم ہے کہ اسی امیر وامام کے ساتھ وابستہ رہنا اپنے لئے واجب سمجھو اور جماعتی زندگی سے الگ نہ ہو، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی نظر میں مادی طاقت امام کی امامت کے لئے معیار ولایت نہیں ہے۔

ایک اور بات اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ شارع علیہ السلام کے نزدیک انسانوں کی بھیڑ کا نام جماعت نہیں ہے؛ بلکہ شریعت کی اصطلاح میں جماعت انسانوں کے اس مجموعہ کا نام ہے جن کا کوئی امام ہو، امیر ہو، والی ہو، ورنہ اس کی حیثیت شارع علیہ السلام کے نزدیک فرقہ کی ہے اور اس طرح کی ٹولی بنانا جس کا کوئی امام نہ ہو، وہ جماعت کا قیام نہ ہوگا؛ بلکہ

فرقہ بندی ہوگی؛ جس کے متعلق شارع علیہ السلام کا حکم یہ ہے کہ **فاعتزل تلک الفرق کلھا** ان تمام فرقوں سے الگ رہو۔

والی کی نظری حیثیت

والی کے متعلق شرعی حیثیت سے مسئلہ کے صاف ہوجانیکے بعد چند الفاظ نظری حیثیت سے بھی عرض کردینا چاہتا ہوں؛ کیونکہ میرے نزدیک اسلامی مسائل میں یہ چیز مناط بحث نہیں ہے؛ بلکہ اس کا درجہ محض اتنا ہے کہ متردد ین کی تفہیم کے لئے جو نظریات کے خوگر ہیں باندازہ فہم مخاطب مسائل شرعیہ کی تشہید وتائید کے لئے بعض موقع میں کام لے لیا جائے اور بس!

بہر حال اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ غیر اسلامی حکومت یا دار الکفر میں جہاں مسلمان بحیثیت اقتدار حکومت اور سلطنت کے مغلوبانہ اور محکومانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اس پر مجبور ہوتے ہیں فقہاء کرام کا یہ لکھنا کہ مسلمانوں کے لئے وہاں بھی مخصوص مسائل فیمابین کے لئے ایک امیر یا دوسرے لفظوں میں والی کی اقامت واجب ہے؛ اس کے لئے ہرگز عقلاً قوت قاہرہ اور جابرہ کا ہونا ضروری شرط قرار نہیں دے سکتے ہیں؛ کیونکہ اگر غیر اسلامی حکومت یا دار الکفر کے مسلمانوں پر جو مغلوبانہ اور مقہورانہ زندگی بسر کرتے ہیں، یہ واجب ٹھیرایا جائے کہ اپنے میں سے ایک ایسا امیر منتخب کریں جو قوت قاہرہ اور جابرہ رکھتا ہو، تو دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ فقہاء غیر اسلامی سلطنت کے مسلمانوں کو یہ فرمارہے ہیں کہ اے غیر اسلامی سلطنت کے مغلوب اور مقہور مسلمانو تم اپنے (یعنی مقہورین اور مغلوبین) میں سے ایک ایسے مقہور اور مغلوب کو اپنا امیر بناؤ جو قوت قاہرہ اور جابرہ رکھتا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اجتماع متناقضین ہے۔

پس میرے خیال میں جو لوگ غیر اسلامی سلطنت میں امیر شریعت کے لئے قوت قاہرہ کی شرط لازم قرار دیتے ہیں اور اس کو فقہاء کرام کا مقصود ومطلب ٹھہراتے ہیں وہ ان بزرگان دین اور مجتہدین پر نادان دوست کی حیثیت سے نعوذ باللہ جہالت کا الزام رکھتے ہیں کہ وہ اتنا بھی

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

نہیں سمجھتے تھے کہ مغلوب اور مقہور جماعت کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ مغلوب ومقہور ہوتے ہوئے اپنے میں سے ایسا امیر منتخب کریں جس کو قوت جابرہ اور قاہرہ حاصل ہو۔

میری سمجھ سے یقیناً یہ نظریہ بالاتر ہے کہ دو متضاد صفتوں کا اجتماع محل واحد میں بحالت واحد کیونکر ہوسکتا ہے اور اگر یہ جائز ہو جائے تو پھر یہ کہنا بھی جائز ہوگا کہ اے جاہلو! تم اپنے میں ایک ایسے جاہل کو اپنا امام بناؤ جو علامہ ہو اور اگر یہ غیر ممکن ہے اور علم وجہل کا اجتماع نہیں ہوسکتا ہے اور شخص واحد جاہل اور عالم نہیں ہوسکتا ہے تو پھر شخص واحد قاہر اور مقہور، غالب اور مغلوب، جابر اور مجبور بھی وقت واحد اور محل واحد میں نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ مقہور ہوتے ہوئے قاہر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مقہور نہ ہو اور مغلوب ہوتے ہوئے غالب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مغلوب نہ ہو۔ مجبور ہوتے ہوئے جابر ہونے کے معنی ہیں کہ مجبور نہ ہو۔ اور ایک ہی شخص کا بحالت واحد مقہور ہونا مقہور نہیں ہونا، مغلوب ہونا اور مغلوب نہیں ہونا مجبور ہونا اور مجبور نہیں ہونا۔ صریح اجتماع نقیضین ہے، جو محال ہے اور فقہاء کرام کی شان تو بہت برتر ہے، معمولی ذی علم انسان بھی اس طرح کی تلقین نہیں کرسکتا ہے کما لا یخفی۔

لہٰذا دار الکفر کے مسلمانوں کے لئے یہ ممکن نہیں ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی ہر طرح کی مجبوریوں اور مغلوبیوں اور مقہورانہ حالتوں کے ساتھ وہ اپنے میں سے ایسا امیر منتخب کریں جو سراسر غالب جابر اور قاہر ہو۔ اور ایسا قاہر کہ اپنی قوت قاہرہ اور جابرہ سے فرمان شریعت کو مسلمانوں سے نہ صرف طوعاً بلکہ کرہاً قبول وتسلیم کرائے اور محض قبول وتسلیم نہیں؛ بلکہ عملی زندگی میں اسکے برتنے پر اسکو مجبور کردے۔

مجھ کو یاد ہے کہ بزم احباب میں ایک مرتبہ ہمارے کانوں نے اپنے ایک محترم دوست سے جب یہ سنا تھا کہ فقہاء کرام تو امیر کے لئے قوت قاہرہ شرط ٹھہراتے ہیں میرے دل نے بے اختیار کہا تھا۔

؎ تو آشنائے حقیقت نہ سخن اینجاست

اور میں نے عرض کیا تھا کہ امیر کے لئے فقہاء نے اگر قوت قاہرہ شرط ٹھہرایا ہے اگرچہ

میری معلومات سے یہ بھی بالاتر چیز ہے (کما سیظہر علیک) تو اس سے مراد غیر اسلامی سلطنت کا امیر نہیں ہوسکتا ہے؛ بلکہ اسلامی سلطنت کا جو اپنے پاس عسکری طاقت اور اپنی حکومت رکھتا ہے، اور ان کے خلاف ان کا مقصود و مراد ٹھہرانا دراصل اپنی قوت فیصلہ کی کمزوری اور "ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد" کے لطیف احساس کی امتیازی نگاہ کی محرومی ہے۔

تسلیم امیر کی نوعیت

اب نظری اور شرعی بحث کے سامنے آجانے کے بعد میں ان لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں جو انسانی شرافت، انسانی حریت کی حقیقت سے واقف ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک بھی سلطنت کی خدمت انجام دینے والے خادم، یعنی بادشاہ، امام، والی، امیر کے لئے یہ ضروری شرط ہے کہ جو شخص مادی طاقت سے آپ پر حکومت کرنے کی استطاعت رکھتا ہو، اسی کا انتخاب عمل میں آنا چاہئے یا اس کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ آپ کا ضمیر خدمت سلطنت کے لحاظ سے جس کو اہل اور سزاوار سمجھے اس کا انتخاب عمل میں آئے اور قوم یعنی ارباب حل وعقد متفقہ طریق پر یا کثرت رائے سے جس کو اس لائق سمجھیں اس کے ہاتھ میں زمام سلطنت وامارت دے دیں۔

میرے نزدیک ایک صحیح جماعت، ایک تعلیم یافتہ قوم، ایک آزاد گروہ، ایک ترقی یافتہ ملک، اپنے امیر وسلطان کو اس لئے نہیں تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے پاس خزانہ رکھتا ہے یا اپنے پاس اعزاز واقتدار کا وافر حصہ رکھتا ہے، یا اپنے پاس پولیس کی ایک جماعت کثیر رکھتا ہے یا اپنے پاس جیل اور قید وبند کے لئے عالی شان اور مضبوط محل رکھتا ہے، یا اپنے پاس بہت بڑی فوج، بہت بڑا سامان جنگ وہلاکت رکھتا ہے۔

بلکہ اس کی تسلیم واطاعت کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ ہمارا منتخب کردہ ہے اور وہ ہم سے وہی بات کہتا ہے جو خود ہمارے ایمان کا اقتضا ہے۔ وہ ہم سے وہی کرانا چاہتا ہے جس کو ہمارے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے اور خود ہم نے اپنے لئے پسند کیا ہے، وہ ہم کو اسی امر کی ہدایت

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کرتا ہے جو قانون یا نظام نامہ کتاب وسنت کی شکل میں اس کے ہاتھوں میں ہے جس کا خدا اور اس کے رسول نے مامور بنایا ہے، نہ کہ قوت واقتدار کے دیو سے مرعوب ہو کر اس کو تسلیم کرتا ہے؛ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ ہمارا ہی عطیہ ہے، اور ہماری ہی متفقہ حمایت کی ایسی قوت اس کے ساتھ ہے کہ ہر فرد اس کا جاں نثار سپاہی ہے، اور اس کے ہر حکم پر کٹ مرنے کے لئے اس وجہ سے تیار ہے کہ وہ ہمارے ہی مفاد، ہمارے ہی حقوق کی حفاظت کے لئے ہم سے ہمارا خون چاہتا ہے پس ہر فرد خوشی سے اپنی جان ومال کو نذر کر دیتا ہے اور ہر خطرہ میں بہ خوشی اپنے کو ڈال دیتا ہے؛ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نظام کا ہر شعبہ صحیح اور قومی مفاد کا ہر پہلو نقصان سے محفوظ رہتا ہے۔ اور ہر شخص اپنی جگہ پر آزاد رہ کر باامن، بے خوف، خوش عیش زندگی بسر کرتا ہے۔

پس سلطنت اور خلافت یا امارت کے لئے یہ شرط لگانی کہ اس کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے گا جو اپنے اندر اقتدار اور قہر کی ایسی سطوت رکھتا ہو کہ اس کی مادی طاقت کے خوف کے اعتبار سے اس کے سامنے انسان مجبور ومقہور ہوں، شرافت انسانی کی توہین ہے، جس کو نہ کوئی شریف قوم گوارا کر سکتی ہے نہ انسان کا آزاد ضمیر غلامی کے اس ناپاک ذلیل مفہوم کو اپنے دماغ میں جگہ دے سکتا ہے، نہ انسان کی فطری حریت کا صحیح احساس اپنے منتخب کردہ کو اپنا ایسا آقا تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو سکتا ہے، نہ دین فطرت اپنے پیرووں کو ایسی تعلیم دے سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ امیر اور والی کا مادی حیثیت سے قاہر وجابر ہونا لازم ہے تو پھر اس کی ولایت میں قوم کی رضامندی وانتخاب کو کیا دخل ہوگا۔ وہ اپنی قوت قاہرہ سے حکومت کرے گا اور جبری حکومت ہوگی، جو شرعاً مجبور ومطلوب نہیں ہے، بلکہ غیر محمود ہے۔

معترضین کی محرومی!

مجھ کو نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ جو بزرگ امیر وخلیفہ، بادشاہ ووالی کے لئے شوکت وطاقت اور قہر وغلبہ کی شرط ضروری سمجھتے ہیں، ان کی تقریر، ان کی تحریر ان کی گفتگو میں

مجھ کو کوئی شرعی دلیل ایسی نہ ملی جس پر اس شرط کی بنیاد رکھی جائے۔

خدا بہتر جانتا ہے، میرے سامنے جب کوئی اس رنگ کی تحریر آئی جس میں اس شرط کی کچھ بھی حمایت کی گئی ہو تو میں نے نہایت ہی تپاک سے اس کا مطالعہ کیا اور ایک ایک سطر بلکہ ایک ایک لفظ کو نہایت غور واطمینان سے پڑھا اور ایک متجسس انسان کی طرح میں نے اپنی پوری سعی اور امکانی کوشش اس پر غور وتامل میں صرف کر دیا؛ مگر میں بدقسمتی سے اپنی تلاش میں محروم رہا اور کوئی چیز مجھے نہ ملی حتی کہ میں نے بعض ارباب علم کی تحریروں کو مکرر اس نقطۂ نظر سے پڑھا کہ قرآن مجید کی آیت نہ سہی، حضرت رسول خدا ﷺ کا کوئی فرمان کوئی حدیث ہی سہی، کیونکہ ہمارے لئے سب سے پہلے یہی دونوں چیزیں اساس دین ہیں۔ مگر پھر بھی میری امید میری محرومی کے ہمکنار رہی۔ اور مجھ کو پوری تحریر میں کوئی حدیث ایسی نہ ملی جس سے اس شرط کی حمایت ہوتی ہو، اور جو ارباب علم کے نزدیک قابل استدلال ہو، پھر بھی موقعۂ استدلال میں بعض ارباب علم نے دو حدیثیں پیش کی ہیں۔ اور ان سے استدلال کیا ہے کہ اس سے امام وخلیفہ کے لئے مادی طاقت کا شرط ہونا سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ان حدیثوں کو اس سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، میں مختصر لفظوں میں ان پر اس لئے نقد کر دینا چاہتا ہوں کہ اس کے بعد حدیث کے نام سے غلط فہمی کا کوئی شخص شکار نہ ہو جائے

پہلی حدیث

قہر وسطوت کی شرط پر غلط استدلال

کہا گیا ہے کہ امام بے طاقت اسلام میں ثابت نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

وانما الامام جنة يقاتل من ورائه ويتقى به۔ (رواہ البخاری ومسلم)

بہ تحقیق امام سپر ہے، اس کے پیچھے لڑائی کی جاتی ہے اور اس کے سبب سے بچاؤ کیا جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دشمنان اسلام کے ساتھ قتال اور دشمنان دین سے بچانا بلا قہر و سطوت و جبروت کیونکر ممکن ہے، اور نظم عساکر وافواج امام ضعیف و عاجز کس طرح کرسکتا ہے؟

میں کہتا ہوں استدلال میں غلط فہمی کا دارومدار اس پر ہے کہ حدیث شریف میں امام کی غرض چونکہ یہ بتائی گئی ہے کہ (**یقاتل من ورائه و یتقی به**) امام کے پیچھے لڑائی کی جاتی ہے اور اس کے سبب سے بچاؤ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے قہر و سطوت اور جبروت کا ہونا ضروری ہے ورنہ اگر اس کو قہر و سطوت اور جبروت حاصل نہ ہوئی تو نہ نظم عساکر کر سکے گا نہ انتظام افواج اس سے ممکن ہوگا۔

لیکن کیا اس کے بعد کہ بنی اسرائیل کی جماعت نے (جن کا واقعہ ابھی مفصل گذر چکا) جب اپنے نبی سے تقرر امام (یا امیر) کی درخواست کی تھی تو اس کی غرض بھی یہی قتال تھی اور اس کی لوگوں نے تصریح بھی کردی تھی، بلکہ جب ان کے نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے ان پر یہ جرح کی تھی کہ ایسا تو نہ کرو گے کہ جہاد کے حکم کے بعد جان چھڑاؤ اور نہ لڑو تو نہایت دردناک الفاظ میں انہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ بھلا ایسا کس طرح ممکن ہوسکتا ہے کہ ہم کو اپنے ایسے دشمنوں سے لڑنے میں عذر ہو جنہوں نے ہم کو ہمارے گھروں سے نکال کر بے وطن کردیا اور اپنے بال بچوں سے علیحدہ کر کے بے جان و مال کر دیا۔

قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۚ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا۔ (البقرۃ: ۲۴۶)	ان کے نبی نے کہا۔ اگر تم پر قتال فرض کردیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ تم نہ لڑو۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے گھروں اور بال بچوں سے تو نکالے جاچکے (اب) ہمارے لئے کونسا عذر ہے کہ خدا کی راہ میں نہ لڑیں۔

اب قابل غور امر یہ ہے کہ ان سب مرحلوں کے طے ہوجانے کے بعد اور صاف لفظوں میں تقرر امام کی غرض سامنے آچکنے کے بعد آیا ان کے نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے ان کے لئے

خداوندی فرمان کے ماتحت ایسے شخص کا انتخاب کیا جو قہر و سطوت اور جبروت رکھتا تھا، یا انہوں نے صاف لفظوں میں بنی اسرائیل کے وفد کو یہ فیصلہ سنادیا کہ خدا نے طالوت علیہ السلام کو تمہارا ملک مقرر کیا اور پھر لاکھ ان کے سامنے انکی غربت اور بے سروسامانی کا اعتراض کیا گیا: اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی؛ بلکہ ان کے اعتراضوں کو رد کردیا گیا اور حضرات طالوت ہی کو ملک رکھا گیا۔

پس کیا ہر منصف مزاج اور ارباب دانش اور اہل علم حضرات کے لئے قرآن کے اس واقعہ میں اس بات کی کھلی بصیرت موجود نہیں ہے؟ کہ موقع استدلال میں جو کچھ کہا گیا ہے اور حدیث مذکور سے جو کچھ سمجھا گیا ہے وہ غلط فہمی کی سخت ٹھوکر ہے اور قرآن شریف کے بالکل خلاف ہے؛ لہٰذا اس غلط استدلال پر یہ نتیجہ نکالنا کہ "اس کے لئے قہر و سطوت اور جبروت کا ہونا ضروری ہے۔ قرآن شریف کی تصریحات کی روشنی میں غلط ہے اور محض غلط نہیں؛ بلکہ اس کو ضروری شرط قرار دینا نص قرآن کے خلاف ہے۔

رہا یہ کھٹکا کہ پھر "نظم عساکر وافواج امام ضعیف و عاجز کس طرح کرسکتا ہے" اسکے متعلق عرض یہ ہے کہ قرآن مجید ہی کی تصریحات کی روشنی میں یہ بھی پڑھ لیا جائے کہ حضرت طالوت علیہ السلام عساکر وافواج کا نظم اپنی غربت و بے سروسامانی کے باوجود کرسکے تھے یا نہیں اور دشمنوں سے قتال کیا تھا یا نہیں، اگر کیا تھا تو پھر سمجھ لینا چاہئے کہ وہ سب کچھ آج بھی ہوسکتا ہے اور کیا جاسکتا ہے، اس کے لئے خلیفہ، امیر، والی کے اندر مزعومہ قہر و سطوت اور جبروت کی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ قوم کی اطاعت واجتماع اور خلیفہ، امام، والی امیر کے قوی وامین ہونے کی ضرورت ہے اور بس۔

چنانچہ حضرت طالوت علیہ السلام کے ساتھ باوجود ان کی بے سروسامانی اور غربت کے جب قوم کا اجتماع ہوا اور قوم نے ان کی اطاعت کی اور ان کی آواز پر کان رکھا تو بے طاقت بادشاہ نے باجبروت سلطنت سے مقابلہ کیا اور ایسا کامیاب مقابلہ کیا کہ دشمنوں کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

ارشاد ہے:

وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔
(البقرۃ:۲۵۱-۲۵۰)

جب (طالوت مع اپنی جماعت کے) جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلہ میں آئے تو دعا کی کہ اے میرے پروردگار ہم پر صبر وسکینت نازل فرما۔ اور جنگ میں ہمارے پاؤں ثابت قدم رکھ۔ اور کافروں کی جماعت پر ہم کو فتح دے پھر اللہ کے حکم سے (نتیجہ یہ ہوا کہ) طالوت اور ان کی جماعت نے (جالوت بادشاہ اور اس کی فوج کو) شکست دیدی۔

افسوس یہ ہے کہ جب نظریہ بدل جاتا ہے، اسلامی روح سے بے تعلقی ہو جاتی ہے، اور گرد وپیش کے اثرات سے انسان اسلامی تعلیمات سے دور پڑ جاتا ہے اور اس کے دل ودماغ پر غیر اسلامی اثرات کا تسلط اور استیلاء ہو جاتا ہے تو پھر وہ ہر چیز کو اسی ماؤف دل ودماغ سے طے کرتا ہے اور اسلامی خصوصیات کو مٹا کر غیر اسلامی شعار اختیار کر لیتا ہے، اور یہیں تک پہنچ کر یہ قصہ ختم نہیں ہو جاتا ہے؛ بلکہ غیر اسلامی خصوصیات کو اسلامی خصوصیات سمجھنے لگتا ہے اور آہ کہ اسی نقطہ پر ٹھہر نہیں جاتا ہے، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس کی تبلیغ کرنے لگتا ہے اور چاہتا ہے کہ ساری دنیا اس کی اس غیر اسلامی شعار میں ہمنوا ہو جائے، ہم شعار ہو جائے، بلکہ ہم رائے ہو کر شریک عمل ہو جائے۔
والقصة بطولها۔

صحیحین کی حدیث کا صحیح مطلب

اس امر کے واضح ہو جانے کے بعد کہ صحیحین کی حدیث:

وانما الامام جنة يقاتل من ورائه ويتقى به (رواہ البخاری ومسلم)

امام ہی سپر ہے کہ اس کے پیچھے لڑائی کی جاتی ہے اور اسی کے سبب سے بچاؤ حاصل کیا جاتا ہے۔

کا مفاد یہ نہیں ہے کہ امام کے لئے قوت قاہرہ اور سطوت جابرہ کا ہونا شرط ہے؛ بلکہ ایسا سمجھنا نص قرآنی کے خلاف ہے۔ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ حدیث کا صحیح مطلب کیا ہے، تو اس کے متعلق سب سے پہلے ایک بات سمجھ لینے کی یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے، اور اس کی تعلیم قانون فطرت کے مطابق ہے؛ یعنی جس طرح قانون فطرت کے ماتحت دنیا کی ہر چیز میں نظام اور وابستگی ہے اور ایک کو دوسرے سے ربط وتعلق ہے؛ اسی طرح اسلام کی تعلیم میں بھی نظام وابستگی کا کامل لحاظ ہے اور وہ اپنے پیروؤں کو صاف لفظوں میں اس کا حکم دیتا ہے کہ

وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۝ (آل عمران:۱۰۳)

مسلمانو! خدا کی رسی کو جماعتی حیثیت سے مضبوطی سے پکڑے رہو اور ایک دوسرے سے الگ نہ ہو۔

اور باہمی انتشار وتشتت اور پراگندگی وتفریق سے مسلمانوں کو روکتا ہے اور تنبیہ کرتا ہے کہ تمہاری زندگی ان غیر مسلموں کی طرح نہ ہو، جن میں کوئی نظام اور رشتہ نہیں ہے۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۝ (آل عمران:۱۰۵)

مسلمانو! ان لوگوں کی طرح نہ بنو جو ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور کھلے کھلے احکام آنے کے بعد آپس میں اختلاف کرنے لگے۔

پھر اسی کے ساتھ اس پر بھی تنبیہ کرتا ہے کہ اگر تم آپس میں متحد ہو کر ایک نظام اور ایک رشتہ میں وابستہ ہو کر زندگی نہیں گذارو گے، تو تمہاری قومی عزت پامال ہو جائے گی، اور تم بے وزن ہو جاؤ گے۔ اور تمہارا کوئی اثر باقی نہیں رہے گا۔ ارشاد ہے:

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ ۝ (الانفال:۴۶)

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ (اپنی جگہ سے) پھسل جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

بہر حال مسلمانوں کا اسلامی شعار جماعتی زندگی پر جینا اور مرنا ہے، اور جماعتی زندگی

Scanned with CamScanner

ایسی منظم زندگی کا نام ہے، جس میں مسلمان ایک امام کے ساتھ وابستہ ہوکر زندگی گذاریں اور ایک مرکز پر جمع ہوکر اپنے کاموں کو انجام دیں، جو فلاح وکامرانی کا اصلی سبب ہے۔ اور اسی کی طرف صحیحین کی حدیث میں اشارہ ہے کہ

انما الامام جنة يقاتل من ورائه ويتقى به۔ (رواہ البخاری ومسلم)

امام سپر ہے، کہ اس کے پیچھے لڑائی کی جاتی ہے، اور اسی کے سبب سے، بچاؤ حاصل کیا جاتا ہے۔

پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ڈھال اپنی بساط بھر نقصان اور اذیت سے بچاتی ہے، اسی طرح مسلمانوں کے لئے امام کا وجود ڈھال ہے، جو اپنی مقدور بھر نقصان واذیت سے مسلمانوں کو بچائے گا اور اس کو غلط راہ پر لگنے سے روکے گا۔

دوسرے ٹکڑے کا مفہوم یہ ہے کہ امام ہی کی ذات ایسی ہے جس کے متعلق شرعاً قوم کا یہ فریضہ ہے کہ جب امام قتال کا حکم دے تو اس کے پیچھے (یعنی اسکی قیادت) میں قتال کرے۔ اور جملہ مفاسد کے دور کرنے اور تمام مہالک سے بچنے میں امام ہی کی طرف رجوع کرے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جنگ میں امام آگے آگے ہو اور قوم اس کے پیچھے پیچھے ہو؛ کیونکہ اس معنی کی حیثیت سے نہ تو خاتم رسالت کی ذات امام ہوگی، نہ خلفائے راشدین کی۔

تیسرے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ اسی کے حکم کے ماتحت تمام مہالک ومفاسد سے بچاؤ حاصل کرنے کی صورتوں پر عمل کرے، حتیٰ کہ اگر آپس میں جھگڑے ہوں، مناقشات ہوں؛ جس میں فتنہ وشر پیدا ہونے کا احتمال ہو تو اس کا فیصلہ امام پر چھوڑ دو اور وہ شریعت کے مطابق جو حکم دے اس کو مانو اور خود رائی نہ کرو اور اس طرح فتنہ وشر سے بچاؤ حاصل کرو۔

حاصل یہ ہے کہ قتال وجہاد کی شرعاً صحیح شکل یہ ہے کہ امام کی قیادت میں یہ کام ہو اور قوم سمع وطاعت کے ساتھ امام کے پیچھے ہو اور ہر قسم کے مفاسد ومہالک سے، بچاؤ حاصل کرنے کی شرعاً صحیح صورت یہ ہے کہ قوم امام کے ساتھ وابستہ ہو اور کامل سمع وطاعت کے ساتھ عملی

جدوجہد میں اس کے نقش قدم پر چلے اور یہی دراصل وہ صحیح ذریعہ اور طاقت ہے جس سے قومی زندگی ہر طرح کی فلاح وکامرانی تک پہونچ سکتی ہے نہ یہ کہ امام ذاتی حیثیت سے مادی طاقتوں سے آراستہ ہو۔

پس صحیحین کی حدیث مذکور کا یہ صاف اور صحیح مطلب ہے، ورنہ اگر اس سے یہ غلط معنی سمجھا جائے کہ اس سے امام کے لئے مادی طاقت اور قوت قاہرہ کا ضروری ہونا مراد ہے اور بغیر اس کے کوئی امام، امام نہیں ہوسکتا ہے۔ تو یہ مطلب نص قرآنی کے خلاف ہوگا اور پھر ایسی صورت میں آیت قرآنی کے خلاف ہونے کی بنا پر حدیث قابل لحاظ نہیں رہے گی۔

علاوہ اس کے امام کے لئے قہر وغلبہ کو لازمی شرط ٹھہرانا اہل سنت وجماعت کی تصریحات کے بھی خلاف ہے۔ بہ نظر اختصار میں اس حدیث کی بحث کے خاتمہ پر اپنی حنفی جماعت کے لئے علامہ ابوالشکور رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح کی نقل پر اکتفا کرتا ہوں جن کے نام سے حنفی جماعت کا شاید کوئی ذی علم ناواقف نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

قال بعض الناس بان الامام اذا لم يكن مطاعافانه اذالم يكن له القهروالغلبة لايكون امامًا ليس كذالك لان طاعة الامام فرض على الناس فلولم يطيعوا الامام فالعصيان حصل منهم وعصيانهم لايضر بالامامة؛ ثم ان لم يكن القهر فذلك يكون من تمرد الناس وتمردهم لا

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جب امام مطاع نہیں رہے گا۔ تو امام ہی نہیں رہے گا۔ اسلئے کہ جب اس کو قہر وغلبہ نہیں حاصل ہوا تو امام نہیں ہوا۔ ہم کہتے ہیں ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ امام کی اطاعت لوگوں پر فرض ہے، پس اگر یہ لوگ امام کی اطاعت نہیں کریں گے تو یہ ان کی جانب سے نافرمانی ہوگی اور ان کی نافرمانی امامت کو نقصان نہیں پہنچا سکتی ہے پھر اگر قہر حاصل نہیں ہے تو اس کا باعث

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

يعزله عن الامامة الاترى ان النبي عليه السلام ماكان مطاعًا في اول الاسلام وكان لايمكنه القهر على اعدائه من طريق العادة والكفرة قدتمردواعن امداده ونصرة دينه وقد كان هذا لايضرو لا يعزله عن النبوة وكذالك الامامة لان الامام خليفة النبي لامحالة وكذٰلك علیؓ ما كان مطاعًا من جميع المسلمين ومع ذلك ما صار معزولًا الخ۔
(تمہید ابی الشکور السالمی ص:۱۸۶)

لوگوں کا تمرد ہوگا اور ان کی سرکشی امام کو امامت سے معزول نہیں کرسکتی ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ نبی کریم علیہ السلام ابتدائے اسلام میں مطاع نہیں تھے اور دشمنوں پر دستور کے موافق قہر کرنا آپ کے لئے ممکن نہیں تھا اور کفاروں نے آپ کی امداد، اور آپ کے دین کی نصرت سے تمرد کیا تھا۔ پھر بھی یہ آپ کی نبوت کے لئے نہ مضر ہوا نہ باعث عزل ہوا۔ یہی حکم امامت کا بھی ہے اس لئے کہ امام لامحالہ نبی کا خلیفہ ہوتا ہے اس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ جملہ مسلمانوں کے مطاع نہیں تھے، مگر باوجود اس کے وہ معزول نہیں ہوئے۔

اس تصریح اور خلافت راشدہ کے عہد مرتضوی کی حالتوں کو سامنے رکھ لینے کے بعد جس کی طرف علامہ نے اشارہ کیا ہے، کوئی مسلمان یہ کہنے کے لئے تیار ہوگا کہ امام وامیر کے لئے ایسی قوت قاہرہ اور جابرہ کا ہونا شرط ہے جس کی بنا پر جبراً اگر اصرار کی گنجائش باقی رہے تو پھر میں اس تصور سے کانپتا ہوں کہ اس کا فیصلہ خلافت راشدہ کے عہد مرتضوی کی نسبت کیا ہوگا۔

دوسری حدیث

امام شعرانی کی کشف الغمہ

اور

حدیث کی حیثیت

بعض لوگوں کی جانب سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''اور اگر امام وسلطان وخلیفہ اور اس کے قضاۃ کو یہ قدرت حاصل نہیں تو وہ امام عاجز امام ہی نہ رہے گا اور نہ قاضی صاحب قاضی؛ بلکہ بمقتضائے اس حدیث کے جس کو امام شعرانی نے ''کشف الغمہ'' جلد ۲ صفحہ ۱۱۷ میں نقل کیا ہے:

قال ابن عباس رضی الله عنهما: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ''الامام الضعيف ملعون وهوالذی يضعف من تنفيذ الامور الشرعية واقامتها۔''

مستحق ملامت ہوگا اور بیعت اہل حل وعقد کے باوجود بھی بوجہ فقدان قہر وغلبہ معزول سمجھا جائے گا۔''

اس عبارت کو پڑھ کر اول نظر میں سب سے پہلے جو چیز سامنے آسکتی ہے وہ یہ خیال ہے کہ کشف الغمہ کوئی حدیث کی مستند کتاب ہوگی جس کے اعتبار پر اس سے بغیر سند کی حدیث استدلال میں پیش کی گئی ہے اور اس شوق میں کہ آج ایک بزرگ کے فیض تحریر سے حدیث کی ایک نئی کتاب کے وجود کا اپنی معلومات میں اضافہ ہوا جب انتہائی ذوق وشوق سے جستجو کے بعد اس کی زیارت اور مطالعہ سے شرف اندوز ہوا تو اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ حدیث کی تلقین تصوف کی قسم کی کتاب سے کی گئی ہے۔

اس طرح کا طریق استدلال اگر کسی عامی شخص کی جانب سے ہوتا تو مجھے افسوس نہیں

Scanned with CamScanner

ہوتا؛ مگر اس بدمذاقی کا کیا ماتم کیا جائے جب مدعی درس وافتاء کے قلم سے ایسی ذلت اور بے راہ روی ہو میں اہل علم حضرات سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اس طریق استدلال پر علمی ذمہ داری اس کی اجازت دے گی؟ فلسفہ کے مسئلہ پر مثنوی سے سند پیش کی جائے اور اس کے ثبوت میں مثنوی حضرت بوعلی قلندر اور مثنوی حضرت مولانا روم کو پیش کیا جائے اور نحو وصرف کے مسائل کی گتھیاں علم طب کی کتابوں سے حل کی جائیں اور معقول کے مسئلہ کے لئے شرح جامی کی ذمہ داری قبول کی جائے، حالانکہ علمائے محققین نے حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے علم وفضل کا پورا احترام رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ان کی کتاب احیاء العلوم جو تصوف کی بہترین کتاب ہے، اس کی حدیثیں موقع استدلال میں نہ تو حدیث کی جگہ پیش کی جائیں گی، نہ احیاء العلوم کا نام کسی حدیث کے حدیث ہونے کے لئے قابل سند امر ہوگا۔

کیونکہ غیر فن کی کتاب ہونے کی حیثیت سے اس میں حدیث کے نقد کے متعلق جو التزام چاہئے نہیں کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں ضعیف ہی نہیں؛ بلکہ بعض موضوع اور بالکل گڑھی ہوئی حدیثیں بھی موجود ہیں اور عموماً ان کتابوں میں ہر طرح کی روایتیں بغیر حوالہ کتاب اور بغیر سند کے نقل کر دی جاتی ہیں؛ جس سے نہ یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ روایتیں کہاں سے لی گئی ہیں، نہ یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کے راوی کیسے لوگ ہیں، ہمیں افسوس ہے کہ یہی بے اصولی یہاں برتی گئی ہے اور بغیر کسی پروا کے اصول کے خلاف موقع استدلال میں کشف الغمہ سے حدیث پیش کی گئی ہے؛ حالانکہ کشف الغمہ کی روایت کو موقع استدلال میں حدیث کی جگہ دینا، اس لئے غلط ہے کہ محض اس کی ذمہ داری پر کوئی روایت حدیث کی نہیں ہوسکتی ہے پھر خصوصاً ایسی روایت جس کی نہ کوئی سند مذکور ہو اور نہ اس کا حوالہ ہو کہ یہ حدیث کہاں سے لی گئی ہے۔

پھر سب سے زیادہ اس سہل انگاری پر افسوس ہے کہ اتنے بڑے عظیم الشان اصولی مسئلہ کو اس طرح طے کیا جاتا ہے کہ تصوف کی الماری سے ایک کتاب نکالی جاتی ہے اور بغیر پروا کسی نقد اور ذمہ داری کے یہ فتویٰ دیا جاتا ہے؛ بلکہ صادق ومصدوق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان

سے جو وحی الٰہی کی ترجمان ہے، یہ فیصلہ کرایا جاتا ہے کہ مسلمانو ''امام ضعیف ملعون ہے'' اور افتاء اور مسئلہ کی عظیم الشان اہمیت کی انکی ذمہ داری کو ٹھیس نہیں لگتی ہے کہ ہمارے اس فتویٰ کا موقع استدلال میں کیا وزن ہے اور کشف الغمہ کی روایت کو جس کی نہ سند مذکور ہے نہ ماخذ، حدیث کے نام سے موقع استدلال میں بغیر تصحیح رواۃ اور اعتماد ماخذ کے پیش کر دینا کس قدر اصولی غلطی ہے جو ایسے موقع میں دیانۃً درایۃً؛ استدلالاً کسی طرح بھی جائز نہیں ہوسکتا ہے، ہاں اگر اس تحریر کو تصوف کے ادارہ میں بیٹھ کر اسی دائرہ کے صاحب وجدان وعرفان نفوس کے لئے لکھا گیا ہو اور وہ جماعت جو ہر چیز کو نقد وتبصرہ اور جرح وتعدیل کے بعد قبول کرتی ہے اس لئے لائق تخاطب نہ سمجھی گئی ہو کہ ''پائے استدلالیاں چوبیں بود'' اور اس بنا پر اس طرح کی سہل انگاری اختیار کی گئی ہو تو پھر نہ میرا اعتراض ہے اور نہ یہ تحریر اس عظیم الشان شرعی مسئلہ میں جو امت مسلمہ کی جملہ فلاح کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے درخور استدلال وتخاطب ہے۔

امام ضعیف کی تعریف

سب سے زیادہ مجھے افسوس سے یہ لکھنا پڑتا ہے کہ کشف الغمہ کی جس عبارت سے استدلال کیا گیا ہے، وہ بھی اس مطلب کے لئے مفید مدعا نہیں ہے؛ کیونکہ اسمیں اسی جگہ امام ضعیف کی تعریف بھی کر دی گئی ہے اور اس مسئلہ کو صاف کر دیا گیا ہے کہ امام ضعیف کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کو قہر وغلبہ حاصل نہ ہو، لہٰذا وہ امام ملعون نہ ہوگا جو قہر وغلبہ نہیں رکھتا ہے؛ بلکہ ضعیف کے معنی یہ ہیں۔

ھوالذی یضعف من تنفیذ الامور الشرعیۃ واقامتھا۔	امام ضعیف ایسے امام کو کہتے ہیں جو امور شرعیہ کا صحیح فیصلہ اور اقامت نہ کرسکتا ہو۔

(کشف الغمہ)

پس یہاں تو قوت وقہر کا کوئی ذکر بھی نہیں ہے، لہٰذا قہر وغلبہ کے ثبوت میں اس روایت کو پیش کرنا بالکل بے معنی ہے؛ جس کو دعویٰ سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور میری سمجھ سے باہر ہے کہ

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

قہر وغلبہ کے ثبوت میں اس کے پیش کرنے کا کیا منشا ہے شاید لفظ ''تنفیذ'' سے یہ دھوکا ہوا ہو، تو عرض یہ ہے کہ تنفیذ کے معنی قہر وغلبہ کے نہیں ہیں؛ بلکہ اس کے معنی ہیں اجرا اور تصویب یعنی امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ علم وعزم میں اتنی صلاحیت اور بصیرت رکھتا ہو کہ وہ صحت کے ساتھ احکام شرعیہ کو جاری کرے اور بلا رورعایت کسی کے حق بات کا اجرا واظہار کرے۔

اور اقامت امور شرعیہ میں جہل ونادانی کی راہ نہ اختیار کرے، اگر تنفیذ کے مفہوم میں قہر وغلبہ شامل ہوتا تو باب قضا میں قاضی کا فریضہ تنفیذ احکام ہے؛ وہاں بھی قہر وغلبہ اس کی تعبیر میں شامل ہوتا؛ حالانکہ تنفیذ قضا کے مفہوم میں قہر وغلبہ شامل نہیں ہے ملاحظہ ہو، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

واما التنفيذ فالاصل فيه ان يكون حكما اذ من صيغ القضاء قوله انفذت عليك القضاء وقالوا اذا رفع اليه قضاء قاض امضاه بشروطه۔ وهذا هو التنفيذ الشرعي۔ ومعنى رفع اليه حصلت عنده فيه خصومة شرعيه۔

(شامی،ص:۳۴۸،ج:۳)

تنفیذ میں اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ حکم اور فیصلہ ہو، اس لئے کہ انفذت علیک القضا فیصلے کے الفاظ میں سے ہے، فقہاء نے کہا ہے کہ جب کسی قاضی کے پاس کسی دوسرے قاضی کے فیصلے کو اٹھا کر لیجایا جائے اور وہ شرط کے موافق اس کو نافذ کردے تو اسی کا نام ''تنفیذ شرعی'' ہے قاضی کے پاس اٹھا کر لیجایا جائے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اجلاس میں شرعی طور پر خصومت پیش ہو۔

ہر معمولی عربی داں شخص بھی سمجھ سکتا ہے کہ تنفیذ کا مفہوم کیا ہوا، صرف یہ کہ قاضی کا فیصلہ جو شرعی خصومت کے لحاظ سے ہی قاضی کے پاس آیا تھا، اس کو شروط کی پابندی کے ساتھ اس نے نافذ کردیا؛ یعنی اس کو صحیح قرار دیا، کیونکہ فقہاء کی اصطلاح میں نفاذ اور عدم نفاذ سے مراد صحت اور عدم صحت ہوتی ہے۔

والمراد من النفاذ الصحة ومن عدمه عدمها لاالصحة مع التوقف۔

(شرح اشباہ،ص:۱۴۳،ج:۱)

''نفاذ'' سے مراد صحت ہے اور عدم ''نفاذ'' سے مراد عدم صحت ہے نہ کہ صحت موقوف۔

تنفیذ کے معنی کی عقود الدریہ میں ان لفظوں میں تصریح کی گئی ہے۔

التنفيذ احكام الحكم الصادر من الحاكم وتقريره على موجب ما حكم به وبه يكون الحكم متفقا عليه۔

(عقود الدریہ،ص:۳۰۲،ج:۱)

''تنفیذ'' کے معنی ہیں اس فیصلہ کو جو کسی حاکم سے صادر ہو چکا ہو، مضبوط کردینا اور جن وجوہ کی بنا پر فیصلہ کیا گیا ہو اس کی تثبیت وتقریر کردینی اور اس کے سبب سے فیصلہ متفق علیہ ہو جائیگا۔

ان تصریحات سے یہ صاف معلوم ہو گیا کہ تنفیذ کے مفہوم کو قہر علی العمل اور سطوت وجبروت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان تصریحات کی موجودگی میں تنفیذ کے لفظ سے قہر وغلبہ سمجھنا عربیت اور شرعی مسائل سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

اور جب تنفیذ کے معنی میں قہر وغلبہ سمجھنا غلط ٹھہرا تو یہ مسئلہ صاف ہو گیا کہ کشف الغمہ میں امام ضعیف کی تعریف میں امور شرعیہ کی تنفیذ میں ضعف سے مراد قوت قاہرہ اور جابرہ کا فقدان نہیں ہے اور نہ امام ضعیف سے محروم القہر والغلبہ مراد ہے اور اس بنا پر الْإِمَامُ الضَّعِيفُ مَلْعُوْنٌ کے یہ معنیٰ کرنا کہ وہ امام جس کے پاس مادی قوت اور مادی سامان نہ ہو وہ ملعون ہے اور اس کو اس معنی میں صاحب کشف الغمہ کی جانب منسوب کرنا انتہا درجہ کی خطرناک غلطی اور شرعی مسائل سے ناواقفیت ہے۔

بلکہ اسی عبارت کا جو کشف الغمہ میں مذکور ہے یہ مطلب ہے کہ جو امام صحت کے ساتھ احکام شرعیہ کے جاری کرنے کی قوت بہ سبب فقدان علم وبصیرت یا بسبب فقدان امانت (خشیت الٰہی) نہ رکھتا ہو وہ ملعون ہے اور اس عبارت کو مادی قہر وغلبہ سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner

اَلاِمَامُ الضَعِیفُ مَلعُونٌ کے غلط معنیٰ کی خطرناک غلطی پر تنبیہہ

اگراس روایت کوحدیث تسلیم کرلیا جائے اوراس حدیث کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ ایسا امام جوقہر وغلبہ کی شان اپنے اندر نہ رکھتا ہووہ ''ملعون'' ہے تو میں بہ ادب سوال کروں گا کہ امام الاولیاء راس الاتقیاء حضرت امیر المومنین علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کی امامت وخلافت کے متعلق کیا فیصلہ ہوگا؟

دنیا جانتی ہے اور تاریخ کے اوراق آج بھی شاہد ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نہ اپنے انتخاب خلافت کے پہلے نہ انتخاب خلافت کے بعد تمام مسلمانوں پر قہر وغلبہ رکھتے تھے؛ مگر دنیا آپ کو خلیفۂ برحق اور خلفاء راشدین میں شمار کرتی ہے اوراس کا یقین وعقیدہ رکھتی ہے اور تمام اہل سنت وجماعت کے نزدیک یہ عقیدہ صحیح ہے۔

پس میری سمجھ سے باہر ہے کہ ان لوگوں کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا جو خلافت اور ملوکیت کے لئے قہر وغلبہ کولازمی امر قرار دیتے ہیں، جب ان سے یہ سوال کیا جائے گا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت ان مجبوریوں کے باوجود تسلیم کی جائے؟ یا ان کو **نعوذ باللہ من شرور انفسنا** معزول خلیفہ سمجھا جائے یا کشف الغمہ کی روایت کے غلط معنیٰ کو **نعوذ باللہ نعوذ باللہ** ان پر منطبق کیا جائے۔

ہاں کسی کو تاریخی واقعات کی اطلاع نہ ہو تو میں محض ان کی تاریخی اطلاع کی نظر سے بغیر کسی تشریح کے ذیل میں چند حوالے نقل کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہوجاتا ہوں اور فیصلہ ناظرین کے ضمیر پر چھوڑتا ہوں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنے امراء کے اجتماع پر قادر نہ تھے

دخل فی عماد الدولة (العباسیه) من کانوا لا یرضو باطنة ومن کان لایمنکھم دفعه کما لم یمکن علیا جمع الامراء الذین هم اکبر عسکرة کالاشعث بن قیس والاشتر النخعی وهاشم المرقال وامثالهم۔ (منہاج السنہ، ص:۲۰۷، ج:۴)

دولت عباسیہ میں ایسے لوگ دخیل ہوگئے جو اندرونی طور پر خوش نہیں تھے اور ایسے لوگ دخیل ہوگئے جن کا نکالنا بھی ممکن نہیں تھا جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی فوج کے اکابر امراء کو متحد کرلینا ممکن نہ ہوا، مثلاً اشعث بن قیس اشتر نخعی۔ ہاشم وغیرہ وغیرہ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قہر وغلبہ حاصل نہیں تھا

فالخلافة التامة التی اجمع علیها المسلمون وقوبل بها الکافرون وظهربها الدین کانت خلافة ابی بکر و عمرو عثمان وخلافة علی اختلف فیها اهل الغلبة ولم یکن فیها زیادة قوة للمسلمین ولا قهرونقص للکافرین ولکن هذا لا یقدح فی ان علیا کان خلیفة راشدا مهدیا لکن لم یتمکن کما یتمکن غیره۔ ولا اطاعته الامة کما اطاعت غیره۔

(منہاج السنہ، ص:۲۰۸، ج:۲)

ایسی خلافت تامہ جس پر مسلمانوں کا اجتماع ہو اور جس کے ذریعہ سے کافروں سے مقابلہ کیا گیا اور جس کے باعث دین غالب ہوا وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہم کی خلافت تھی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت میں اہل غلبہ کا اختلاف ہوگیا نہ مسلمانوں کی قوت زیادہ رہی نہ کافروں پر قہر رہا، نہ کافروں کے لئے نقصان کی صورت رہی؛ لیکن پھر بھی اس سے حضرت علیؓ کی خلافت راشدہ مہدیہ پر کوئی اعتراض لازم نہیں آئیگا مگر (یہ امر ایک واقعہ ہے کہ) ان کو وہ اقتدار حاصل نہیں ہوا جو ان کے غیر کو حاصل ہوا اور امت مسلمہ نے انکی اطاعت اس طرح نہ کی جس طرح انکے غیر کی اطاعت کی۔

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمانؓ کے قاتل کے قتل پر قادر نہ تھے

قد اعتذر بعض الناس عن علی انه لم یکن یعرف القتلة باعیانهم اوکان لایری قتل الجماعة بالواحد اوبانه لم یدع عنده ولی الامر دعوی توجب الحکم له ولاحاجة الی هذه الاعتذار بل لم یکن علیؓ مع تفرق الناس علیه تمکنا من قتل قتلة عثمان الابفتنة تزید الامر شرا و بلاءً۔ ودفع افسد الفاسدین بالتزام ادناهما۔ اولی من العکس لانهم کانوا عسکرا وکان لهم قبائل تغضب لهم والمباشر منهم القتل وان کان قلیلاً فکان ورائه اهل الشوکة۔

(منہاج السنہ ص:۳۰۹، ج:۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے بعض لوگوں نے یہ عذر بیان کیا ہے کہ وہ بلوائیوں میں سے خاص ان لوگوں کا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل تھے، علم نہیں رکھتے تھے، یا یہ کہ شخص واحد کے مقابلہ میں وہ ایک جماعت کے قتل کو جائز نہیں سمجھتے تھے، یا یہ کہ خون کے وارثوں نے ان کی عدالت میں دعویٰ نہیں کیا جس کی بنا پر ان پر اس کے متعلق فیصلہ دینا لازم ہوجاتا؛ حالانکہ ان عذرات کی کوئی حاجت نہیں ہے؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں کے تفرق کے باعث حضرت عثمان کے قاتلین کے قتل پر قادر نہیں تھے، بغیر ایسی صورت اور فتنہ کے جو شر اور فساد کو بڑھا دیتا اور اصول یہ ہے کہ بڑے فساد کو معمولی فساد کے الزام سے دفع کردینا زیادہ بہتر ہے۔ اس لئے کہ ان کے قاتلین ایک لشکر تھے جن کے ساتھ جنگ کے لئے قبائل تھے قتل کے مرتکب گرچہ تھوڑے تھے مگر ان کی پشت پر بڑی طاقت والے لوگ تھے۔

انصار و مہاجرین سے تقریباً نصف لوگوں نے بیعت نہیں کی تھی

واما علی فمن حین تولی تخلف عن بیعته قریب من نصف المسلمین من السابقین الاولین من المهاجرین والانصار وغیرهم ممن قعد عنه فلم یقاتل معه ولاقاتله مثل اسامة بن زید وابن عمر و محمد بن سلمة ومنهم من قاتله ثم کثیر من الذین بایعوه رجعوا عنه۔ الخ۔

(منہاج السنہ ص:۲۲۶، ج:۴)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے وقت مہاجرین، اور انصار وغیرہ تقریباً نصف لوگ بیعت سے الگ رہے ان میں بعض ایسے لوگ تھے جنہوں نے نہ انکے ساتھ ہوکر مقاتلہ کیا نہ ان کے مقابلہ میں جنگ کی مثلاً اسامہ بن زید، ابن عمر، محمد بن سلمہ، انمیں بعض ایسے لوگ تھے جنہوں نے حضرت علیؓ سے مقاتلہ کیا پھر بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے حضرت علیؓ سے بیعت کی تھی؛ حضرت علی سے الگ ہوگئے۔

حضرت علی کی خلافت میں مسلمان عاجز اور کفار قاہر تھے

این اجتماع المسلمین وفتح بلاد اعداء من الفرقة والفتنة بین المسلمین وعجزهم عن الاعداء حتی یأخذوا بعض بلادهم وبعض اموالهم قهرًا وصلحًا۔

(منہاج السنہ ص:۱۲۶، ج:۳)

(حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں) مسلمانوں کے انتشار اور باہمی فتنہ اور دشمنوں کے مقابلہ میں کمزوری کے باعث مسلمانوں کا اجتماع اور دشمنوں کے بلاد کی فتح کہاں تھی (یعنی اجتماع مسلمین اور فتح بلاد درخصت و مفقود) اور مسلمان دشمنوں کے مقابلہ میں عاجز تھے؛ یہاں تک کہ دشمنوں نے مسلمانوں کے بعض ملکوں اور بعض مالوں کو قہراً اور صلحاً لے لیا۔

اس تاریخی حقیقت کو خاتم المحققین و آخر المتکلمین حضرت مولانا شاہ ولی اللہ

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ازالۃ الخفاء میں نہایت صاف لفظوں میں بیان فرمادیا ہے۔ اختصاراً میں اس کے صرف دو اقتباس پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

حضرت علی مرتضی باوجود رسوخ قدم اودر سوابق اسلامیہ وفور اوصاف خلافت خاصہ انعقاد بیعت برائے او و وجوب انعقاد رعیت فی حکم اللہ بہ نسبت او متمکن نہ شد در خلافت دور اقتدار ارض حکم او نافذ نہ گشت وتمامہ مسلمین تحت حکم او سر فرد دنیا ورند و جہاد در زماں دے رضی اللہ عنہ بالکلیہ منقطع شد وافتراق کلمہ مسلمین بظہور پیوست واختلاف ایشان رخت بعدم کشید ومردم بحروب عظیمہ با او پیش آمدند دوست اورا از تصرف ملک کوتاہ ساختند وہر روز دائرۂ سلطنت اولا سیما بعد تحکیم تنگ تر شدن گرفت تا آنکہ در آخر بجز کوفہ و ماحول آں برائے ایشان صافی نماند وہر چند این خللہا در صفات کاملہ نفسانیہ ایشان خللے نینداخت لیکن مقاصد خلافت علی وجہہا متحقق نہ گشت۔

(ازالۃ الخفاء ص: ۱۲۳، ج: ۱)

قوم مامور نہ شد کہ تحت رایت او قتال کنند چنانکہ مامور شدند بقتال تحت مشائخ ثلثہ و مطابق ازیں احادیث مفہوم شد بمعائنہ درخارج دیدیم کہ در زمانہ حضرت مرتضی

حضرت علی مرتضی کے لئے سوابق اسلامیہ رسوخ اور اوصاف خلافت خاصہ کے وفور کے باوجود انکے لئے بیعت تامہ کا انعقاد اور احکام الٰہی میں رعیت کی اطاعت ان کے دور خلافت میں حاصل نہ ہوئی اور اقطاع زمین میں ان کا حکم نافذ نہیں ہوا اور تمام مسلمانوں نے ان کے حکم کے ماتحت سر نیاز نہیں جھکادیا اور ان کے زمانہ میں جہاد بالکلیہ بند ہوگیا اور مسلمانوں میں افتراق پیدا ہوگیا اور آپس کا اتفاق ناپید ہوگیا اور لوگوں نے ان کے ساتھ بڑی بڑی جنگیں کیں اور ملکی تصرفات میں ان کے ہاتھ کو کوتاہ بنادیا، یعنی قبضہ تصرف سے بہت سے ملک نکل گئے اور تحکیم کے بعد سے خصوصاً ان کی حکومت کا دائرہ تنگ رہنے لگا۔ یہانتک کہ آخر زمانہ میں بجز کوفہ اور اس کے مضافات کے کوئی جگہ پاک وصاف ان کے لئے نہیں رہی، ہر چند ان نقصانات نے ان کے ذاتی صفات کاملہ میں کوئی خلل نہیں پہنچایا مگر مقاصد خلافت صحیح معنوں میں پورا نہ ہوا۔ قوم اس کے لئے تیار نہ ہوئی کہ ان کے

عنایت الٰہی کہ سابق فوج نازل می شد مستتر گشت۔ کوشش بسیار فائدہ اند کہ ہم نہ داد وخیریت کہ عبارت از الفت مسلمین **فیما بینهم** وترک منازعت ست و اتفاق بر جہاد کفار روز بروز شکست بر کفار افتادن رو باستتار نہاد۔ ومعنی **ليمكنن لهم و بينهم الذى ارتضى لهم** یعنی **ليمكنن بسعيهم دينهم** صورت نہ بست وتمکین فی الارض برائے دفع کفار واعلاء کلمۃ الاسلام مقرر بود واقع نہ شد **واجعل لى من لدنك سلطاناً نصيرا** دریں زمان متحقق نہ گشت و در تمام مسلمین حکم او نافذ نہ شد و مسلمین کلہم تحت حکم او نیامد وہیچ عاقلے برین معنی انکار نمی تواند کرد۔ چنانکہ نمی تواند انکار نمود کہ آفتاب امروز از مشرق طالع شدہ است۔

(ازالۃ الخفاء ص: ۳۳۴، ج: ۱)

جھنڈے کے نیچے قتال کرے جیسا کہ خلفائے ثلاثہ کے ماتحت اس نے قتال کیا تھا اور احادیث (فتن) کے مفہوم کے مطابق خارج میں عیاناً آنکھوں کے سامنے آگیا کہ حضرت علی مرتضی کے زمانہ میں خدا کی وہ عنایت جو پہلے انبوہ در انبوہ نازل ہوتی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی اور بڑی سے بڑی کوشش نے معمولی سا بھی فائدہ نہیں پہنچایا اور مسلمانوں کا باہمی اتحاد اور جھگڑے سے علیحدگی اور جہاد پر اتفاق اور کفاروں کی شکست ایک ایک کرکے ہر چیز غائب ہوگئی اور معنی **ليمكنن لهم دينهم الذى ارتضى** الخ کی صورت پیدا نہ ہوئی اور کفاروں کے دفع اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے تمکین فی الارض کا بھی وقوع نہیں ہوا۔ **واجعل لى من لدنك نصيراً** کا بھی اس زمانہ میں ظہور نہ ہوا، نہ کل مسلمان ان کے حکم کے تابع ہوئے اور یہ واقعات ایسے ہیں کہ کوئی عاقل انسان اس کا انکار اسی طرح نہیں کرسکتا جس طرح اس کا انکار نہیں کرسکتا ہے کہ آج آفتاب پورب سے نکلا ہے۔

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

مسلم قوم کی شخصیت اسلام کی نظر میں

بساط بحث کے لپیٹنے سے پہلے غلط فہمی کا ازالہ کر دوں کہ میرے گذشتہ سلسلۂ مضمون کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ اسلام اپنے پیروں کو فقط آسمانی اور روحانی سلطنت کا خوشگوار پیام امن سناتا ہے اور صومعہ احبار اور زاویہ رہبانیت کی زندگی کی دعوت دیتا ہے اور سجادہ و مصلے پر درود وسلام اور تسبیح و تقدیس کے ایک لاکھ روزانہ ختم کو وہ اصلی اسلامی زندگی اور عزیمت کی راہ قرار دیتا ہے۔ اور فقر و مسکنت اور بے چارگی و بے نوائی، جمود و خمود اور عزلت نشینی کو مسلمان کا شعار بتاتا ہے اور عاقبت و آخرت کے نام پر دنیا میں محکوم اور ذلیل زندگی گذارنے کی تعلیم دیتا ہے اور اپنے پیرووں کو ایسی بے اثر جماعت (جس کی اقوام عالم میں کوئی قیمت نہ ہو، اور جو ایک بے کیف اور مردہ جذبات کی زندگی رکھتی ہو) دیکھنا چاہتا ہے حاشا وکلا۔ اس کو اسلامی تعلیم، اسلامی تخیل، اسلامی ذہنیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلام مسلمانوں کو یکسر اور تمام تر مرد میدان میں دیکھنا چاہتا ہے اس کی نظر میں ہر مسلمان فطرتاً دنیا میں خدائی دین کا مجاہد اور مبلغ بن کر قدم رکھنا چاہتا ہے اور یہ لازمی منصب ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے پیرووں کو سب سے سرفراز، سب سے سربلند، سب سے زیادہ غیور اور خوددار قوم بنکر زندگی گذارنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ اپنے پیرووں کو بتاتا ہے کہ چونکہ تم مومن ہو، تم ہی سب سے سربلند ہو، تمہارے ہی لئے دنیا میں عزت و عظمت کا تاج ہے تم ہی خدا کی جانب سے خدا کے خلیفہ اور اس کی دنیا کے حاکم ہو، تمہارے ہی لئے "تمکین فی الارض" ہے، اور تمہارے ہی لئے "خلیفۃ اللہ فی الارض" کا خطاب ہے۔ تمہاری ہی عظمت کا دنیا میں جماؤ اور قیام ہوگا۔ تم اس لئے پیدا کئے گئے ہو کہ قوموں کو صحیح راہ پر لگاؤ اور صحیح راہ کی دعوت دو۔ اصلاح کی طرف مائل کرو۔ امر بالمعروف کی خدمت انجام دو۔ برائی سے روکو، غلط روی پر ٹوکو، غلط اقدام سے منع کرو اور سمجھاؤ۔ صبغۃ اللہ اور شعائر الٰہیہ کی طرف ان کو بلاؤ اور جذب کرو، اور اس راہ میں

اس اصلاح میں، اس نیکی میں، اس دعوت میں، اس امر بالمعروف میں، اس نہی عن المنکر میں ایثار کرو، قربانی کرو، دکھ اٹھاؤ، اپنے کو لٹاؤ اور جو کچھ سامنے آوے خوشی سے اسکو لبیک کہو؛ ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کرو۔ تمہارا یہ فرض ہے کہ سوتے کو جگاؤ، لیٹے ہوئے نیم خواب لوگوں کو اٹھا کر بٹھاؤ۔ بیٹھے ہوئے کو کھڑا کر دو، اور جو کھڑے ہو چکے ہیں ان کو دوڑاؤ گری ہوئی جماعت کو اٹھا دو، ٹھٹھرے ہوئے جذبات کو ابھار دو، بجھی ہوئی طبیعتوں میں حرارت پیدا کرو، افسردہ خاطر اور ہمت شکستہ لوگوں کو ڈھارس دو پیام امید بن کر ان کے سامنے جاؤ خدا کے لطف و کرم کی بارش بن کر ان پر برسو، طمانیت و سکینت کی روح بن کر ان کی رگ و پے میں ساری و طاری ہو جاؤ، امیدوں کے ملجا و ماوے، توقعات کے مرکز و مناط، بے کسوں اور حرماں نصیبوں کے غمگسار بن جاؤ، مظلوموں کو سینے سے لگالو، ظالم کا ہاتھ پکڑو اور اس کو بغیر مداہنت کے خدا کا پیام پہنچاؤ کہ خدا کے یہاں ظلم پسندیدہ نہیں ہے۔ وہ اس سے راضی نہیں ہوتا ہے۔ اس کے قانون رد عمل کا نتیجہ نہایت ہولناک ہے۔ قبل اس کے کہ خدا کا قانون محیط ہو جائے۔ بادلوں کی طرح سر پر چھا جائے اور ہولناک رعد و برق کے ساتھ تاریک ابر و باد بنکر نقمت و غضب کی صورت میں تمہاری بربادی کا باعث ہو۔

متنبہ ہو جاؤ، سنبھل جاؤ، خدا کی طرف رجوع کرو اور اس کی بارگاہ میں انابت کرو، اور گڑگڑا کر عرض کرو۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

مگر کیا؟

یہ تمام امور بغیر اس امر کے انجام نہیں پا سکتے کہ مسلمانوں کے پاس سب سے پہلے اور تمام عمل سے پہلے قیصر و کسریٰ کی طرح مادی حکومت ہو اور ان کے زیرِ نگیں کیانی اور رومی ساز و سامان ہو۔ اور کیا ان کے لئے ان ہی مادیات کی موجودگی ذریعہ حیات و بقا ہے؛ جس سے یہ جماعتیں مالا مال تھیں: ہر گز نہیں۔

بلکہ اس چیز کی ضرورت ہے جس نے ان سامانوں کو تہ و بالا کر دیا، اس چیز کی ضرورت ہے جس نے ان سب کو تاراج و برباد کر دیا، اس چیز کی ضرورت ہے جس کے ہاتھوں ان سب کی ہلاکت و بربادی ہوئی، اس چیز کی ضرورت ہے جس کی تاب یہ مادی ساز و سامان نہ لا سکے اور انتہائی کوشش اور سعی کے بعد بھی مقابلہ میں اپنے کو ثابت نہ رکھ سکے اس چیز کی ضرورت ہے جس سے مادی ساز و سامان قدموں میں پڑ کر نثار ہو جاتا ہے، اس چیز کی ضرورت ہے جس سے دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں بندہ بے درم ہونے پر مجبور ہو جاتی ہیں، اس چیز کی ضرورت ہے جو قوموں کے دلوں میں رعب و ہیبت پیدا کرتی ہے، اس چیز کی ضرورت ہے جس کے نام سے، جس کی حقیقت، سے جس کی ماہیت سے، جس کی طاقت سے، جس کے اثر سے اور جس کے نفوذ سے دنیا کی قومیں کانپتی ہیں اور گھبراتی ہیں۔

اور اس سے بھی زیادہ صاف لفظوں میں یہ ہے کہ اس چیز کی ضرورت ہے جو عہد نبوی میں تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی میں تھی۔ جس نے بے سرو سامانی کے ساتھ پورے عرب کا مقابلہ کیا۔ بدر کی لڑائی لڑی۔ قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کو برباد کر دیا۔ وحشیوں کو متمدن، غیر مہذبوں کو مہذب لٹیروں کو امین، ظالموں کو عادل، خوں خواروں کو غم گسار، بدکاروں کو نیکوکار اور آپس میں جنگ و جدال کرنے والوں کو بھائی بھائی، مفلسوں، بکریوں کے چرواہوں کو انسانوں کا چرواہا اور بادشاہ بلکہ بادشاہ گر بنا دیا۔ اور دنیا کی

تاریخ میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا جو صفحۂ تاریخ پر ہمیشہ روشن حرفوں میں نقش رہے گا۔

مسلمانوں کو اس کی دعوت دی گئی ہے، مسلمانوں کے اسی اسوہ کو پیش کیا گیا ہے، مسلمانوں کو اسی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مسلمانوں کو اسی کی اتباع و تقلید کا حکم دیا گیا ہے اور ایک طرف ان کو ان کے خدا نے اگر یہ حکم دیا ہے کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (الاحزاب:۲۱۰)

(مسلمانو!) تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں ہر طرح کا بہتر نمونہ موجود ہے۔

تو دوسری طرف اس کے رسول نے بھی اس کو یہ پیام دیا ہے کہ

من يعش منكم بعدى فسيرى اختلافًا كثيرًا فعليكم بسنتى وسنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ۔ (ترمذی وغیرہ)

میرے بعد جو شخص تم میں زندہ رہے گا۔ وہ کثرت سے اختلاف آراء دیکھے گا۔ ویسی حالت میں تم لوگ میری سنت اور میرے خلفاء راشدین کی سنت کو اختیار کیجیو اور اس پر مضبوطی سے جم جائیو۔

مسلمانوں کو عجمیت کی طرف نہیں رہبری کی گئی، قیصر و کسریٰ کے شعار و زندگی کی دعوت نہیں دی گئی، ان کا فریضہ اسوۂ سلاطین عجم اور ملوکیت نہیں قرار دیا گیا، ان کو شعار کفر کی اتباع و تقلید کا حکم نہیں دیا گیا، ان کے لئے دلیل راہ اور کلید و مفتاح غیر اسلامی چیزیں نہیں بتائی گئیں؛ بلکہ ان کو اس سے روکا گیا۔ منع کیا گیا اور ان چیزوں کو تباہی و بربادی کا باعث بتایا گیا۔

پھر آہ! کہ آج یہ کیا ہے کہ ہماری نگاہیں یکسر مغربیت پر جمی ہوئی ہیں، اور آہ! یہ کیا ہے کہ ہمارے دماغ تمام تر مغربی تخیل کے گرویدہ ہیں، اور آہ! یہ کیا ہے کہ ہمارے قلوب بالکلیہ یورپ کے جذبات کے دفینہ ہیں اور آہ! یہ کیا ہے کہ ہم یورپ کے شعار میں جذب ہو کر اپنے کو آہستہ آہستہ فنا کر رہے ہیں۔

اے غیور مسلمان! اے خوددار مسلمان! اے زندہ اسلاف کے اخلاف مسلمان! اے

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دنیا پر برتری اور عظمت رکھنے والی مسلمان قوم! اللہ تو اسوہ نبویؐ سے منحرف نہ ہو، اللہ تو عہد نبوت کی سنت سے الگ نہ ہو، اللہ تو خلافت راشدہ کو مت بھول، تیرے لئے وہی دلیل راہ ہے، وہی کلید باب ہے، اسی میں نجات ہے، وہی سبیل رشاد ہے، وہی صراط مستقیم ہے پس ولایت و امارت کا وہی نقشہ صحیح ہے جو آج سے پہلے اسوۂ نبوی اور عہد نبوی اور ابتداء عہد خلفائے راشدین میں تھا۔

مادیت قومیت اسلامیہ کی ماہیت اور حقیقت ثابتہ نہیں ہے، بلکہ مادی طاقت صحیح اسلامی فطرت، اسلامی حقیقت، اسلامی ماہیت، اسلامی شعار کے لئے خادم وغلام ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ لوازم سے حقیقت اور اعراض سے ماہیت متعلقات شئی سے قوام شئے کا حصول ہوتا ہے۔

مادیت سے حریت، ایثار فدائیت، اسلامی روح اسلامی فطرت، اسلامی ماہیت نہ کبھی حاصل ہوئی ہے نہ آج حاصل ہوگی، ہاں اسلامی فطرت، اسلامی ماہیت، اسلامی ایثار، اسلامی حریت سے البتہ ماہیت کا حصول ہوا اور آج بھی اس کا حصول ہو سکتا ہے؛ بلکہ وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے ہوا مگر شرط یہ ہے کہ ہم آج کے بنکر نہ رہیں؛ بلکہ اس زمانہ کے بن جائیں جس پر تیرہ سو سال گزر چکے ہیں۔

یعنی اپنے اندر جماعتی روح پیدا کریں، تنظیمی شکل پیدا کریں، ایثار وقربانی کے جذبات پیدا کریں، خلوص وللٰہیت کا اپنے قلوب کو نشیمن بنائیں۔ شریعت اسلامیہ کے اصول وقانون کے ماتحت ایک امام ووالی پر جمع ہو جائیں، سمع وطاعت اپنا شعار بنالیں۔ ''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيْعًا'' کو مضبوطی سے تھام لیں اَطِيْعُوا اللهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ کے ماتحت زندگی گذاریں، جمود وخمود کو ختم کریں، اسلامی شعار سے آراستہ ہو جائیں، خلیفۃ اللہ کے منصب کو اپنا مرکز عمل قرار دیں ''وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ'' کے طرۂ امتیاز کو اپنے سامنے رکھیں ''كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ'' کو اپنی زندگی کا دستور العمل قرار دیں ''ادخلوا فی السلم کافۃ'' کو اپنا سراپا بنالیں اور اس کپکپا دینے والی خدا ورسول کی وعید وعقاب کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھیں۔

وَ اَطِيْعُوا اللهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جھگڑا نہ کرو، ورنہ پھسل جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَ اَشَدَّ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔
(المؤمن:۸۲)

کیا لوگ ملک میں نہیں چلے پھرے اور اس بات پر نظر نہیں کی کہ جو قومیں ان سے پہلے گذر چکی ہیں، ان کا کیسا انجام ہوا؛ حالانکہ وہ قومیں شمار میں ان سے کہیں زیادہ تھیں اور آثار اور مادی قوت کے اعتبار سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں؛ لیکن اس دنیا کا کیا دھرا کچھ کام نہ آیا۔

عن حذيفة بن اليمان عن النبى صلى الله عليه وسلم قال والذى نفسى بيده لتامرن بالمعروف وتنهون عن المنكر وليوشكن الله ان يبعث عليكم عذابًا منه فتدعونه فلا يستجيب لكم۔
(ترمذی ابواب الفتن، جلد دوم)

نبی کریم ﷺ سے حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور کا ارشاد ہے کہ تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو (ورنہ ڈر ہے) کہ تم پر خدا ایسا عذاب مسلط کر دے کہ پھر تم اس کے لئے دعائیں کروگے، مگر اس کی استجابت نہیں ہوگی۔

انا امركم بخمس، والله امرنى بهن الجماعة والسمع والطاعة والهجرة والجهاد فى سبيل الله فانه من خرج من الجماعة قيد شبر فقد خلع ربقة الاسلام عن عنقه الا ان يراجع ومن دعا بدعوى الجاهلية فهو من

میں تم کو پانچ باتوں کے لئے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے مجھ کو دیا ہے۔ جماعت، سمع وطاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے جماعتی زندگی کی

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

جثی جھنم قالوا: یا رسول اللہ وان صام وصلی قال وان صلی وصام وزعم انہ مسلم۔

(اخرجہ احمد)

جگہ انتشار وتفریق کی دعوت دی تو انکا ٹھکانا جہنم ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا اگر چہ وہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو فرمایا: ہاں اگر چہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور اپنے زعم میں اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔

کہاں ہیں علمائے امت، کہاں ہیں صلحائے مذہب، کہاں ہیں زعمائے جماعت، کہاں ہیں مصلحین ملت، کہاں ہیں لیڈران قوم کیا میری دردمندانہ نحیف آواز ان کے حضور میں سنی جائے گی۔ اور کیا وہ پھر ایک مرتبہ اس کو سماع قبول بخشیں گے۔ کیا وہ ملت مسلمہ کے انتشار و پراگندگی کو ختم کرنے کے لئے اپنی استبدادیت کو اسلام کے لیے، اسلام کے مفاد کے لیے، مسلمانوں کی قابل رحم جماعت کے لئے اور اس کی جماعتی مفاد کے لئے ختم کردیں گے۔

خطاب بہ علمائے کرام

خصوصیت سے اس مسئلہ میں میرے مخاطب علماء کی ذمہ دار جماعت ہے اور میں نہایت ادب سے ان ہی کی جماعت کا ایک نااہل فرد کی حیثیت سے مراتب واحترام کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے یہ عرض کرنیکی جرأت کر رہا ہوں کہ سب سے پہلے آپ اپنی ذمہ داری محسوس فرمائیں اور اپنی قیادت کی ذمہ دارانہ مقدس مناقب کے تخیل کے ساتھ اپنی عملی زندگی اور سعی کی تہی مائیگی پر بھی غور فرمائیں اور امت مسلمہ کے انتشار پراگندگی کے علل واسباب پر غور فرمائیں کہ کیا سب سے زیادہ اس میں ہمارا اور آپ کا ہاتھ نہیں ہے، پس ضرورت ہے کہ سب سے پہلے آپ اور ہم اپنی اپنی استبدادیت اور جماعتی عصبیت اور تفریق کو ختم کریں اور اس کے بعد امت مسلمہ کو اتحاد کی دعوت متفق اللفظ ہوکر دیں اور **لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ** کی وعید کا مورد ہونے سے پہلے اپنے کو بچالیں اور حضرت حذیفہؓ کی حدیث کو اپنے سامنے رکھیں اور التزام امیر

کا جو پہلے اپنی گردن پر پورے شرح صدر کے ساتھ رکھیں اور پھر امت مسلمہ کو اس کی دعوت دیں کہ سنو اخدا کا حکم یہ ہے اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے۔

اعداد و استطاعت: بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اور بحث ونظر کا ایک ضروری پہلو پھر بھی ہنوز تشنہ ہے کہ کیا یہ تسلیم کیا جائے کہ مادی طاقت کا حصول اسلامی تعلیم کے منافی ہے؟ اور کیا واقعات اس کا ساتھ دیں گے کہ سلم وصلح کے سب سے بڑے حامی نبی عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مادی طاقت بہم نہیں کیا؟ اور کیا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے تیغ وسنان سے کام نہیں لیا؟ اور کیا آلات جہاد رباط خیل کے متعلق احادیث میں خصوصیت کے ساتھ ابواب کے ابواب اس کی فضیلت میں موجود نہیں ہیں۔

ان سب کا واحد جواب اس تسلیم کے ساتھ کہ مادی طاقت کا حصول اسلام میں مطلوب ہونے کے باوجود ملت اسلامیہ کے قوام کا جز وغیر منفک نہیں ہے، اثبات میں ہے کہ بے شک تاریخ کے صفحات پر احادیث کے ابواب میں یہ سب کچھ موجود ہیں، مگر پھر بھی فوجی طاقت، عسکری قوت، جابرانہ اقتدار کو ولایت اسلامیہ کی ماہیت میں دخل نہیں ہے۔

مجھ کو اس اعتراف میں ذرہ برابر بھی تردد اور لومۃ لائم کا خوف نہیں ہے کہ اسلام ''اہنسا پرمودھرمہ'' کی تعلیم نہیں دیتا ہے؛ بلکہ وہ ہنسا کی تعلیم دیتا ہے، وہ قتال وجہاد کا حکم دیتا ہے؛ بلکہ مخصوص مواقع میں خون بہانے کو فرض قرار دیتا ہے؛ مگر کہاں؟ جہاں فتنہ کو مٹانا ہو۔ بغاوت وطغیان کو فرو کرنا ہو، وہ مادی طاقت کو بھی فراہم کرنا ضروری قرار دیتا ہے۔ اور جہاں دشمنوں کو مرعوب رکھ کر حفظ ماتقدم مدنظر ہو۔

لیکن پھر بھی باوجود اس کے اسلام چونکہ دین فطرت ہے اور ہر جگہ مسلمانوں کے لئے اجتماعی زندگی کو لازمی امر قرار دیتا ہے، اس لئے وہ قوت قاہرہ اور فوجی طاقت اور عسکری نظام کو مسلمانوں کے لئے اس کے والی کی ولایت کی ماہیت کے لئے لازمی امر قرار نہیں دیتا ہے۔ کیونکہ ایسا قرار دینا خود اس کے فطرتی ہونے کا رد ہوتا اور تکلیف مالا یطاق ہوتا؛ جس کے معنی

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دوسرے لفظوں میں یہ ہوتے کہ اسلام انسان کے لئے قابل قبول نہیں ہے، جو آمدنی سے زیادہ ٹیکس طلب کرتا ہے اور استطاعت سے زیادہ اعداد اور تیاری کا حکم دیتا ہے، پس اس نے یہ صاف اعلان کردیا کہ اعداد یعنی دشمنوں کے مقابلہ میں تیاری تو فرض اور ضروری ہے مگر استطاعت کی قید لگی ہوئی ہے۔

ارشاد ہے:

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ (الانفال:٦٠)

(مسلمانو!) حسب استطاعت جہانتک تم سے ہو سکے ہر طرح کی قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے دشمنوں کے لئے تیار رکھو؛ کیونکہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر نیز ان (معاندین) پر جن کو تم نہیں جانتے ہو، اللہ انکو جانتا ہے۔ اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے۔

حاصل یہ کہ یہ تخیل کہ فوجی طاقت، عسکری نظام، جابرانہ اقتدار، قاہرانہ اختیار، استطاعت ہو یا نہ ہو، ولایت کے لئے لازمی شرط ہے۔ اسلامی تعلیم نہیں ہے، نہ ہوسکتی ہے، نہ عقل اس کا ساتھ دے سکتی ہے نہ فطرت اور قانون قدرت کی جانب سے اس کی تائید ہوسکتی ہے۔

پس مسلمانوں کا والی دار الاسلام میں ہو یا دار الکفر میں، استطاعت سے باہر کہیں بھی اس کی ولایت کے لئے مادی طاقت شرط اور لازم نہیں قرار دی جاسکتی ہے؛ بلکہ ہر جگہ استطاعت سامنے ہوگی اور وہی مناط کار ہوگی اور یہ اسلام کا ایسا اصولی مسئلہ ہے کہ اس کے پورے نظام پر محیط ہے اور اس کے تمام احکام میں استطاعت کی شرط ملحوظ ہے۔ بحث کے اس پہلو پر یہ چند اشارات ہیں جو اپنے اندر تفصیل کی وسعت و پنہائی رکھتے ہیں مگر ناظرین کی کراہت طبع کے خطرے سے ہم اس کو آئندہ کی فرصت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

خطاکار

عبد الصمد رحمانی مونگیری

۵ر ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner